رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۵ عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۳ پیسے

بی - اے اسلامیات اور قانون کے طلباء وکلاء اور حاکمان عدالت
کی خصوصی توجہ کے لئے

تفسیر سورۂ نور

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

ھدیہ مجلد ــــ ساڑھے چار روپے

* سورۂ نور کی یہ تفسیر در اصل مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر " تفہیم القرآن "، جلد سوم کا ایک حصہ ھے جسے وکلاء، حاکمان عدالت، لا کالجوں، اسلامیات اور معاشرتی علوم کے طلباء و اساتذہ کے لئے الگ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ھے -

* اس سورہ کی اس تفسیر میں ناظرین کو اسلامی قانون اور نظام معاشرت کے متعلق ایسی معلومات ملیں گی جو انہیں آردو اور انگریزی ھی میں نہیں، خود عربی زبان میں بھی کہیں یکجا صورت میں نہیں ملیں گی - اس کا مطالعہ انہیں نہ صرف اسلام اور اسکے احکام کو سمجھنے میں بہت بڑی مدد دے گا بلکہ انکی بہت سی غلط فہمیاں بھی رفع کرے گا -

* اس کتاب کے مطالعہ سے پڑھنے والے کے سامنے قرآن کے ساتھ حدیث کے تعلق اور حدیث کے ساتھ فقہ کے تعلق، اور مختلف فقہی مذاھب کے باھمی تعلق کی ایسی صاف اور واضح تصویر آ جاتی ھے جسے اگر کوئی شخص کھلے دل سے اور غور سے دیکھ لے تو وہ ان غلط فہمیوں میں ھرگز مبتلا نہیں رہ سکتا جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں منکرین حدیث نے آج کل پھیلا رکھی ھیں -

* اس کتاب میں آپ کو زنا اور قذف اور لعان کا اسلامی قانون ملے گا، پردے اور استیذان کے متعلق قرآن مجید کی ھدایات ملیں گی، اسلامی نظام معاشرت کے متعلق ایسی تعلیمات ملیں گی جو مسلمانوں کی اخلاقی و اجتماعی زندگی کے لئے اساس و بنیاد کی اھمیت رکھتی ھیں اور جن کا جاننا ھر مسلمان کے لئے ضروری ھے یہ کتاب انشاءاللہ ان تمام شبہات کو بھی رفع کر دے گی جو اسلام کے نظام معاشرت اور پردہ وغیرہ کے بارے میں جدید زمانے کے غلط اثرات کی وجہ سے ھمارے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذھن میں پیدا ھو گئے ھیں -

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۵	فروری ۱۹۶۱ء	عدد ۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

یہ ضروری نہیں کہ غلط بات لازمی طور پر ایک غیر مخلص انسان کے مُنہ سے ہی نکلے۔ کبھی مرتبہ ایک غیر مخلص شخص صحیح بات کہہ دیتا ہے اور ایک مخلص آدمی جذبات کی رَو میں بہہ کر اپنی زبان سے ایک ایسی بات نکالتا ہے جس کی اُس سے توقع نہیں ہوتی۔ اخلاص اور عدمِ اخلاص کے درمیان خطِ امتیاز کوئی فعل نہیں ہوتا بلکہ وہ نیت ہوتی ہے جو اس کا محرّک بنتی ہے۔

خدا کی عدالت میں ہر فرد کو اس کی جزا اور سزا اُس کی نیت کے اعتبار سے ملے گی مگر اس دنیا میں محض اخلاص کسی فرد کے صحیح اور برحق ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ کسی شخص کے صرف نیک نیت ہونے سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ ہم اس کی رائے کو بلا چون وچرا قبول کرلیں۔ ہمیں کسی چیز کے ردّ و قبول سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جس بات کی اُس میں ترغیب دی جارہی ہے وہ خدا کے فرمان کے مطابق ہے یا نہیں۔

ہمارے اسلاف و اخلاف میں کتنے دردمند لوگ ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے ملّت کی حالتِ زار دیکھ کر مختلف قسم کے منصوبے تجویز کیے اور بعض کو عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی مگر وہ ساری تدابیر حسن کے پیچھے حسنِ نیت موجود بھی تھا، مبنی برحق نہ تھیں۔ مثال کے طور پر کسی دردمند نے یہ دیکھا کہ غیر مسلم سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں پر سبقت لیے جارہے ہیں تو اس نے بڑے اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کے اندر انگریزی تعلیم کو رواج

دینے کا پروگرام بنایا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ کسی نے یہ دیکھا کہ مسلمان مالی اعتبار سے ابنائے وطن سے کمزور ہیں تو اس نے مسلمانوں کو بنک کھولنے پر آمادہ کیا۔ کسی نے انشورنس کی بنا ڈالی۔ اس قسم کی مخلصانہ کوششیں مسلمانوں کا ایک دردِ دل رکھنے والا طبقہ عرصہ دراز سے کر رہا ہے اور اب غیر مسلم اقوام کی ترقی دیکھ کر ان میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے مخلصانہ منصوبے جن کے پیچھے بڑے ہی نیک اور مقدس جذبات کام کرتے ہیں مسلمانوں کی سرزمین میں بارآور نہیں ہوتے۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جو گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔ ان صفحات میں ہم آج اسی موضوع پر چند گذارشات پیش کریں گے۔

ابھی حال ہی میں شام کے ایک دردمند ادیب اور صاحب علم بزرگ نے اصلاح کے گہرے جذبے کے ساتھ ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے بڑی دردمندی کے ساتھ مسلم قوم کی اجتماعی بیماریوں کا منصفانہ جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا تدارک کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کے ایک ایک لفظ سے مصنف کا خلوص جھلکتا ہے۔ مگر وہ اسی خلوص کو جب غلط جگہ استعمال کرتے ہیں تو اس سے بعض عجیب و غریب قسم کی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے اس وقت پوری کتاب کا تجزیہ کرنا تو بڑا مشکل ہے۔ اس لیے ہم یہاں صرف اس کے ایک باب پر بحث کرتے ہیں۔ اس کے مطالعہ کرنے سے اُس غلط طرزِ فکر کا ادراک ہو سکتا ہے جو قوم کے بعض غم خواروں نے ملّت کی فلاح و بہبود کے پیش نظر اختیار کر رکھا ہے۔

زیر تبصرہ مضمون کا عنوان ہے حق الضیافۃ۔ اس میں فاضل مصنف سب سے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے ہاں مہمان نوازی کے کوئی آداب نہیں۔ صبح ہو یا شام، وقت

ہو، یا سب وقت ہر وقت مہمان نوازی ہوتی رہتی ہے اور خواہ ہم کتنے ہی ضروری کام میں مصروف ہوں مہمان کے جذبات و احساسات کا ناجائز پاس کرنا ہمارا ایک قومی شعار سا بن گیا ہے۔ فاضل مصنف نے مہمان نوازی کے بعض ایسے طریقوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں کسی حد تک اصلاح کی گنجائش موجود ہے اور فی الواقع اُن پہلوؤں سے اصلاح ضروری بھی ہے مگر انہوں نے اصلاحِ حال کے لیے جو طرزِ فکر اختیار کیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط اور اسلام کے یکسر منافی ہے۔

مہمان نوازی کے حقوق و فرائض کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ یہ بتاتے ہیں کہ دراصل مہمان کی عزت و تکریم کا تصور جو مسلمانوں میں صدیوں سے رائج چلا آرہا ہے۔ وہ اُس وقت کے معاشی ماحول کا نتیجہ ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ حضور کے عہد میں چونکہ صحرائے عرب میں ہوٹلوں کا رواج نہ تھا اور مسافر لوگوں کے گھروں پر ٹھہرنے کے لیے مجبور تھے اس لیے حضورؐ نے مہمان کی پاسداری کی تاکید فرمائی۔ مگر اب ہوٹلوں کے قیام اور ریستوران کی ترقی کے زمانہ میں مہمان نوازی کی اتنی اہمیت باقی نہیں رہی جتنی کہ اُس وقت تھی۔ لہٰذا اب ہمیں اس کے پورے ڈھانچہ کو بدل دینا چاہیے۔

فاضل مصنف کی مہمان نوازی کے بعض غلط طور طریقوں پر گرفت بھی صحیح سہی لیکن اصلاحِ حال کے لیے جو دلیل پیش کی جارہی ہے وہ یکسر باطل اور اسلام کے تصورِ اخلاق کے بالکل منافی ہے۔ اُن کے طرزِ استدلال کو اگر صحیح قبول کر لیا جائے تو پھر سارے اسلام کو ہی بالآخر خیر باد کہنا پڑے گا۔ اگر آج مہمان کی عزت و تکریم کو دورِ نبوی کے مخصوص معاشی حالات کا ہی نتیجہ سمجھ لیا جائے تو اسلام کا کونسا پہلو ایسا رہ جاتا ہے جو زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہے گا، پھر اسلام کے کس جزو کو بقا اور دوام نصیب ہو گا اور قرآن کے

اس دعوے میں کہ وہ قیامت تک کے لیے واضح ہدایت ہے کیا وزن باقی رہ جاتا ہے۔ اگر آج ایک شخص مہمان نوازی میں اس اصول کو تسلیم کر لیتا ہے تو کل دوسرا سُود کو اسی کلیہ کے تحت جائز قرار دے دیگا اور کہے گا کہ یہ سُود کی حرمت جس کا اتنا غلغلہ بلند کیا جا رہا ہے وہ بھی اُس دَور کے مخصوص معاشی حالات کی وجہ سے ہے اور اب زمانے کے بدلے ہوئے تقاضے اس اصول میں بھی ترمیم و تنسیخ کے متقاضی ہیں۔ اسی طرح پھر سُود سے آگے بڑھ کر رقص و سرود، قمار بازی، شراب خوری اور زنا تک کے جواز کے لیے راہ ہموار ہو سکے گی۔ اگر آج عقل و فکر کا رہوار استدلال کی اس غلط راہ پر چل نکلا تو پھر اسلام کا کوئی قانون اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

اور اس معاملہ میں لطف کی یہ بات ہے کہ عقل کا یہ بدمست رہوار نہ صرف اسلام کی عملی تعلیمات کو روندتا ہُوا آگے بڑھے گا بلکہ اس کی ٹھوکروں سے عقائد اور عبادات تک بھی نہ بچ سکیں گی۔ اسی دلیل کی بنا پر ایک آدمی بڑی آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ تصورِ توحید جس پر اسلام کو بڑا ناز ہے وہ بھی اس وقت کے معاشی ماحول کی کرشمہ سازی ہے جس میں حضور سرورِ کائنات نے آنکھیں کھولیں۔ حضورؐ کا تعلق چونکہ ایک ایسی سرزمین سے ہے جس میں دُور دُور تک صحرا پھیلے ہوئے ہیں اسی لیے اُن کے اندر ایک خدا کا احساس بیدار ہوُا اسی طرح جنّت کی آسائشیں اور دوزخ کی کلفتیں جو ایک مُسلم کے فکر و عمل کے بہت قوی محرکات ہیں وہ بھی عرب کے مخصوص جغرافیائی حالات کا پرتو ہیں۔ عرب میں پانی کی چونکہ قلت ہے اس لیے جنّت کا جو تصوّر انہیں دیا گیا ہے اس میں نہریں اور میوہ جات بہت بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے کہ "مخصوص حالات" کو اگر استدلال کی بنیاد بنا دیا جاتے تو پھر معاملہ کہاں جا پہنچتا ہے اور اس سے کس قسم کے غلط نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

اس طرزِ استدلال کے حاملین کی بنیادی خامی یہ ہے کہ یہ لوگ فلاح و کامرانی کے سارے معیارات مغرب سے مستعار لیتے ہیں اور پھر انہی کے مطابق امّت کی اصلاحِ حال کرنے کے لیے کمربستہ ہوتے ہیں۔ اسلام چونکہ اُن کے دل پسند معیارات کا ساتھ نہیں دیتا اور اُن کی راہ میں قدم قدم پر مزاحم ہوتا ہے اس لیے وہ اسے راستے سے ہٹانے کے لیے بڑے ادب سے اُس کے حضور میں عرض کرتے ہیں کہ تم بڑے مقدس اور واجب الاحترام ہی سہی مگر چونکہ تمہارا تعلق ایک مخصوص عہد سے ہے اس لیے تم اُسی میں صحیح اور برحق تھے اور اس دور کے لوگوں کے لیے تم نے رشد و ہدایت کا فرض بھی فی الواقع بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا مگر اب جبکہ رہوارِ زمانہ نے تمھیں گرد کی طرح بہت پیچھے پھینک دیا ہے اس لیے اب تمھیں ماضی کی ایک مقدس یادگار سمجھتے ہوئے تمہارے حضورؐ میں سرِ نیاز تو خم کرسکتے ہیں مگر تمہیں عملی زندگی میں راہنما نہیں بنا سکتے کیونکہ تم میں اب وقت کے تقاضوں سے پوری طرح نمٹنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔

یہ ہے متجددین کا وہ عام احساس جو کسی نہ کسی طرح اُن کی پوری احتیاط کے باوجود اُن کی تحریروں اور تقریروں میں وقتاً فوقتاً منعکس ہوتا رہتا ہے۔ جو لوگ ذرا جرأت مند اور صاف گو ہیں وہ اسے کھل کر کہتے ہیں کہ "زمانہ نے جو چولی اُتار کر پھینک دی ہے، انسانیت نے جن جنگلوں کو خیرباد کہا ہے اُن کی طرف بلانے والوں کی آواز وحشت اور دیوانگی کی آواز ہے"۔ اور جو ذرا کمزور اور مصلحت بیں ہیں وہ اسی بات کو بدلے ہوئے تقاضوں اور حالات کی مجبوریوں کا نام لے کر بیان کرتے ہیں مگر ان سب کا احساس ایک ہی ہے کہ اسلام دورِ جدید میں انسانیت کی رہنمائی نہیں کرسکتا اور اگر اسے رہنما تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تو پھر اس میں حالات کے تحت اتنا تغیّر و تبدّل ضروری ہے کہ اسلام اور مغربی فکر و عمل میں بغیر نام کے کوئی امتیاز باقی نہ رہے، اور اس طرح یہ دین مغربی معیارات پر

پورا اُتر سکے۔

جس احساس کو عام طور پر "زمانے کے تقاضے" کے نام سے بیان کیا جاتا ہے وہ دراصل زمانے کے تقاضے نہیں بلکہ مغربی اقدار کے تقاضے ہیں۔ جنہیں ان متجددین کی ذہنی مرعوبیت نے زمانے کے ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ زمانہ دراصل مغرب ہی ہے اور جو کچھ وہاں اس وقت موجود ہے وہی صحیح اور برحق ہے اور فطرت کے عین مطابق۔ اس لیے ہمارے اپنے ملک اور قوم میں اگر کوئی چیز ایسی موجود ہے جس کی نظیر وہاں نہیں ملتی تو وہ بوسیدہ اور ناکارہ ہے اور اس لائق ہے کہ اسے فوراً مٹا دیا جائے۔ اسی طرح اگر وہاں کسی نظریہ یا عمل کو قبولِ عام ہے اور ہمارے ہاں وہ ناپید ہے تو ہمیں اسے فوراً رواج دینا چاہیے کیونکہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو پھر ہم زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں گے اور زمانہ ہم سے ہماری رجعت پسندی کی بنا پر سخت انتقام لے گا۔

یہ بنیاد جس پر ہمارے متجددین کے فکر و عمل کی ساری عمارت تعمیر ہوئی ہے بہی غلط اور کمزور ہے۔ مغربی اقدار کو زمانے کے تقاضے نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی مغربی تہذیب کے استیلاء کو فطری مجبوریوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مغربی تمدن کوئی معیارِ حق و باطل نہیں جس کے مطابق ہم اپنے افکار و اعمال کو پرکھنے پر مجبور ہیں۔ یہ ایک باطل تہذیب کی عملداری اور غلط رجحانات کا دھارا ہے جسے ہم اپنی کوتاہ نظری سے زمانے کے تقاضے یا عصری مطالبات سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور یہی ہمارے نزدیک ہمارے فکر کی بنیادی خامی ہے۔

ہم جب بھی اپنے معائب کا جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں تو مغرب کی عینک لگا کر ساری صورتِ حال پر نگاہ ڈالتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے عیوب اور

کمزوریوں کو اچھی طرح دیکھ نہیں پاتے۔ ہماری تنقید کا ہدف ہر پھر کر وہی موضوعات بنتے ہیں جو مغرب کی نظر میں قابلِ اعتراض ہیں اور جن میں اہلِ مغرب ترمیم اور تصحیح چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے پورے معاشرتی، سیاسی، سماجی نظام اور روحانی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کرنے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں اور اُن پہلوؤں میں تغیرات کا مطالبہ کرتے ہیں جن میں کسی تبدیلی کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اُن حصوں کو صحیح سمجھ کر جوں کا توں رہنے دیتے ہیں جو سرتاپا غلط ہیں اور جن کے وجود سے ملت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ اسی بنیادی نقطۂ نظر کے تغیر کا اعجاز ہے کہ آج اس ملت میں رقص و سرود، قمار بازی اور زنا کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو کسی تشویش کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا رہا ہے بلکہ اس کی باقاعدہ پشت پناہی ہو رہی ہے اور اگر کسی چیز سے ہم پریشان نظر آتے ہیں تو وہ عفت و عصمت کا وہ مضبوط نظام ہے جو ہمارے اخلاق کے لیے حصار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہے وہ غلط نقطۂ نظر جس نے ذم کو مدح، معائب کو محاسن اور مثالب کو مناقب میں بدل دیا ہے۔ اور ہم خواہ مخواہ احساسِ کہتری میں مبتلا ہو کر صحیح تصورات کو بھی باطل ٹھہرا رہے ہیں۔

مثال کے طور پر اسی مہمان نوازی کو ہی لیجیے ہم نے اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے مغرب کی تقلید میں یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ فعل اپنے اندر صرف معاشی پہلو رکھتا ہے اور اس میں کوئی روحانی یا اخلاقی عُنصر شامل نہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلفاء کے عہد میں چونکہ ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کا رواج نہ تھا اس لیے مسلمانوں کو مہمانوں کی تعظیم و تکریم کی ہدایت فرمائی گئی۔ اب چونکہ ٹھہرنے کے لیے جگہ جگہ ہوٹل موجود ہیں اس لیے مہمان نوازی کا یہ تصور تبدیلی چاہتا ہے۔ مہمان نوازی کے بارے میں یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ مہمان کی عزت و توقیر اور اس کی خدمت ایک معاشی ضرورت نہیں بلکہ ایک اخلاقی تقاضا ہے، اس میں معاشیات کا کوئی عنصر شامل نہیں بلکہ یہ سراسر ایک روحانی اور دینی فریضہ ہے۔ یہ مسئلہ جیب اور پیٹ کا

نہیں بلکہ اخلاق اور روحانیت کا ہے۔ مہمان اور میزبان کا تعلق کوئی معاشی تعلق نہیں بلکہ ایک خالص انسانی تعلق ہے۔ اس سے انسانوں کے درمیان محبت اور اخوت بڑھتی ہے احساسِ یگانگت ترقی پاتا ہے اور امت کے مختلف طبقات کے درمیان جو بُعد اور دُوری ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ پھر چند لقموں کا یہ "زیاں" اور تھوڑے سے آرام و آسائش کی یہ "قربانی" انسان کے اندر بعض ایسی صفات کی پرورش کرتی ہے جو انسانیت کا بیش قیمت ورثہ ہیں۔ اس سے انسان کے اندر ہمدردی اور تعاون کے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ ایثار، سیر چشمی اور فراخ دلی جیسی بنیادی انسانی صفات ترقی کرتی ہیں۔ انسانوں کے اندر بے غرضی اور بے نفسی پیدا کرنے کا یہ ایک عملی پروگرام ہے اس لیے اسے محض ایک معاشی ضرورت سمجھ لینا اور پھر اس کے مطابق اصلاحِ حال کے لیے تجاویز پیش کرنا بنیادی طور پر غلط ہے اور اس سے امتِ مُسلمہ کو دینی اور روحانی اعتبار سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

مغرب کا یہ معاشی معیار ہم پر اتنا غالب ہو چکا ہے کہ اب ہم نے اولاد جیسی مقدس اور قیمتی متاع کو بھی زر و مال کے پیمانے سے ماپنا شروع کر دیا ہے۔ اولاد اب ایک بوجھ ہے جس کی کثرت ہمارے لیے تباہی اور بربادی کا پیغام ہے اور اس کی قلت ہمارے حق میں نافع اور سکون بخش ہے۔ غور کیجیے کہ اولاد کے بارے میں ہم نے جو یہ حکم لگایا ہے اس میں سوائے معاشی محرکات کے کوئی اور محرک بھی کار فرما ہے۔ ذی روح انسانوں کو بے جان سکوں کے عوض تولنے کا یہ طریق کار ہم نے مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب سے مستعار لیا ہے اور پھر اسے ہم فلاحِ امت کے نام سے اپنے ہاں رواج دینے کے آرزو مند ہیں۔ اگر اولاد ایک خالص معاشی مسئلہ ہو تو پھر یہ تجزیہ بالکل صحیح اور درست ہے لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس مسئلہ کو بھی مہمان نوازی کی طرح صرف ایک معاشی مسئلہ سمجھ کر اسے جیب اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ یہ مسئلہ معاشی سے کہیں زیادہ انسانی اور

اخلاقی ہے۔ ماں باپ اس "معاشی بوجھ" کو اگر یہ فی الواقع بوجھ ہی ہے، بڑی خندہ پیشانی سے اٹھانے پر آمادہ ہوتے ہیں بلکہ بعض "خوش نصیب" جن پر یہ بوجھ قدرت لادنا پسند نہیں کرتی وہ اپنی اس "خوش بختی" کو اپنی سب سے بڑی سیاہ بختی خیال کرتے ہیں اور عمر بھر اس بات کی تمنا کرتے ہیں کہ کاش اُن کی پُشت بھی اس کی زیر بار ہو۔ اس بوجھ کے اٹھانے سے ایک انسان کو جو روحانی اور اخلاقی فوائد حاصل ہوتے ہیں اُن کا اندازہ کوئی معاشی پیمانہ نہیں کر سکتا۔ ان کی صحیح قدر و قیمت وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھوں نے زر و مال کی تنگ حدود سے نکل کر انسانیت اور اخلاق کے نقطۂ نظر سے اِن فوائد کا جائزہ لیا ہے۔ اولاد کی محبت انسان کے لطیف جذبات کی نہایت احسن طریق سے پرورش کرتی ہے۔ انسان کے اندر دوسروں کے دکھ درد کی خاطر اپنے آرام اور چین کو قربان کرنے کا احساس بیدار کرتی ہے

یہی اولاد کی محبت میاں بیوی کے تعلقات میں استحکام کا ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھائیوں اور بھائیوں کے درمیان اور بہنوں اور بھائیوں کے درمیان ایک ہی خاندان کی آغوش میں رہنے کی وجہ سے ایسے لطیف احساسات جنم لیتے ہیں جن کی قدر و اہمیت کو دنیاوی مال و متاع کی میزان میں کبھی نہیں تولا جا سکتا۔ معاشی عُنصر ایک اولاد کے معاملے میں اگر کچھ وزن رکھتا بھی ہے تو وہ بہت کم ہے۔ اس میں جو دوسرے عناصر شامل ہیں وہ اس ایک عنصر پر بہت زیادہ بھاری ہیں۔ مگر ہم نے مغرب کی پیروی میں اسی ایک معاشی پہلو کو دوسرے سارے پہلوؤں پر غالب کر دیا ہے۔

فکر و نظر کا یہ تغیر اب ہم سے نہ صرف اس بات کا طالب ہے کہ ہم دورِ جدید میں اپنے سارے مسائل مغربی نقطۂ نظر سے حل کریں بلکہ یہ ہم سے اب اس بات کا بھی تقاضا کر رہا ہے کہ ہم اپنے ماضی سے جو تعلقِ خاطر رکھتے ہیں اُس میں بھی مغربی ذوق کے مطابق مناسب تبدیلیاں کر لیں۔ آئیڈیل کی اسی تبدیلی کی وجہ سے اب ہم نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم اور اُن کے جلیل القدر اصحاب کے بارے میں عجیب و غریب تصورات پیش کرنے لگے ہیں۔ حضور سرورِ دو عالم کی حیاتِ طیبہ جو ہمارے لیے ایک مثال کی سی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے بارے میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قیامت تک ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے اسے ہم صرف ایک "نامہ بر" کی حیثیت دے رہے ہیں۔ حضورؐ کے اعمال، حضورؐ کے فیصلے اور حضورؐ کے احکام اب ہمارے لیے محض "قصۂ پارینہ" ہیں۔ وہ ہمارے لیے حجت نہیں رہے۔ مغربی افکار سے مغلوب عقلیں اب یہ باور نہیں کر سکتیں کہ کسی ایک فرد کی زندگی اتنی صحیح اور مثالی ہو کہ وہ قیامت تک کے لیے انسانیت کی ہدایت کا سامان فراہم کرے۔ جس طرح مغربی سائنس اور فلسفہ سیمابی مزاج رکھتے ہیں اور زمانے کی ہر رو ان کے اندر تغیر و تبدل پیدا کر دیتی ہے اسی طرح ہم اسلامی تعلیمات کو بھی حالات و واقعات کے تابع سمجھتے ہیں اور یورپین نظریات کی پیروی میں یہ برملا کہنے لگے ہیں کہ حضورؐ کے ارشادات زمان و مکان کے پابند ہیں۔ اور زمانہ کے نئے نئے تقاضوں کا ساتھ دینے سے یکسر قاصر ہیں۔ وہ اپنے دور میں صحیح اور مثالی تھے اور ان کی پیروی اُن لوگوں پر فرض تھی جو آپ کے عہد میں زندہ رہے لیکن آج جب زمانے نے بہت سی نئی کروٹیں لی ہیں اور بہت سے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں وہ ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے۔

مغربی فکر و نظر کے مطالبات جنہیں ہم نے غلط فہمی سے عصری تقاضوں کے ہم معنی سمجھ رکھا ہے، اب اتنے بڑھتے جا رہے ہیں کہ ہماری زندگی کا کوئی گوشہ اور ہمارے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ اُن کی زد سے محفوظ نہیں رہا۔ یہ اب نہ صرف ہمارے موجودہ مسائل کو ایک خاص نہج سے حل کرنے کا تقاضا کرتے ہیں بلکہ اس بات کے بھی طالب ہیں کہ ہم اپنے ماضی اور اُس کے سارے واقعات کو بھی مغربی ذوق کے مطابق مرتب کریں تاکہ نہ صرف ہمارا حال مغربی تہذیب سے ہم آہنگ نظر آئے، بلکہ ہمارا ماضی بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا

دکھائی دے اور جب ہم تاریخ کے چلمن میں سے جھانک کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو کہ ہمارے تاریخی پس منظر میں بھی کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو مغربی نقطۂ نظر سے کچھ بھی مغائرت رکھے۔ چنانچہ دیکھیے کہ ماضی کے لٹریچر پر نظرِ ثانی کا مطالبہ جس کو چند سالوں سے بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھایا جا رہا ہے اُس کا محرک بھی سوائے مغربی ذوق کے اور کوئی چیز نہیں۔ ماہ دسمبر میں انجمن حمایت اسلام کے زیرِ اہتمام جو جلسہ ہوا اور جس میں حضور سرورِ کائنات کی سیرت کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے وہ بھی اسی اندازِ فکر کی غمازی کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں جو روئیداد اخبارات میں شائع ہوئی اسے ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ اس تجویز کے پیچھے کونسے جذبات کام کر رہے ہیں یہاں ہم اس تجویز کے متعلقہ حصے نقل کرتے ہیں:

> مولانا غلام مرشد نے علمائے اسلام کی اس فروگزاشت پر کڑی نکتہ چینی کی کہ بعض ضعیف روایات ہمارے اسلامی لٹریچر میں اب بھی موجود ہیں جن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے حتیٰ کہ حضورؐ پاک کی ازواجِ مطہراتؓ پر نمایاں حملوں کا مواد ہماری کتب سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس بے ادبی کا باعث اور بد طینت نقادوں کے آخذ کو حذف کرنا حضور نبی کریمؐ سے محبت کا تقاضا اور اُن کی غلامی کا اولین مطالبہ ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ رسولِ پاکؐ کی تکریم کے لیے ان روایات کو مسترد کر دینا چاہیے جو کسی بھی طرح حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کو مسخ صورت میں پیش کرتی ہیں۔" (بحوالہ نوائے وقت مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۶۰ء)

خود اس مطالبہ اور اس مطالبہ کی تائید میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اسلامی لٹریچر کی "تطہیر" کی یہ ضرورت ہماری ذاتی ضرورت نہیں بلکہ ہم یہ غرض صرف اس لیے سر انجام دینا چاہتے ہیں تاکہ بد طینت مستشرقین اور اُن کے اندھے مقلدین کو مطمئن کیا جا سکے ورنہ یہ روایات جنہیں آج عجمی سازش کہہ کر دریا برد کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے وہ صدیوں سے ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں اور ہمارے

اسلاف نے آج سے بہت عرصہ پیشتر بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ غلط اور صحیح کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے۔

ہم اس معاملہ میں اس بات کے دعویدار نہیں کہ ماضی میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اُس کا ہر حرف مبرا عن الخطاء ہے اور اس پر کوئی تنقیدی نگاہ ڈالی نہیں جا سکتی بلکہ اس سلسلہ میں ہماری گذارش صرف اسی قدر ہے کہ آپ بیشک اپنے لٹریچر کا تنقیدی جائزہ لیں مگر یہ کام سرانجام دیتے ہوئے اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ آپ کہیں مغربی فکر و نظر سے تو مرعوب نہیں اور [illegible] تو آپ کو اس کام پر آمادہ نہیں کر رہا۔ ہمارے اسلاف نے بھی یہی خدمت بڑے احسن طریق سے سرانجام دی ہے اور جو چیز اُن کے سامنے آئی اُسے احتیاط کی ہزاروں چھلنیوں میں سے چھان کر قبول کیا مگر اُن کے ردّ و قبول کا معیار وہ تھا جو انہیں قرآن و سنت سے ملا تھا وہ اُس دَور کے غیر اسلامی افکار و نظریات سے متاثر نہ تھے۔ اس حقیقت کو آپ ایک مثال سے سمجھیے۔ حضرت انسؓ سے ایک حدیث مروی ہے۔

حُبّبَ الی من الدنیا النساء والطیب وجعلت قُرّۃُ عینی فی الصلوٰۃ	دُنیا کی چیزوں میں سے میرے لیے عورتیں اور خوشبو پسندیدہ ہیں اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

اب اسی حدیث پر مستشرقین اور ائمۂ سلف دونوں نے تنقید کی ہے۔ مستشرقین نے اسی روایت کا سہارا لیکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ ہوس کار اور بندۂ نفس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کو یہ باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا ہے کہ وہ انسان جسے عورتوں اور خوشبو سے محبت ہو وہ روحانی اعتبار سے ارفع و اعلیٰ نہیں ہو سکتا۔

ائمۂ سلف نے بھی اس حدیث کا تنقیدی جائزہ لیا ہے مگر اُن کی بحث کا انداز بالکل

جداگانہ ہے۔ انہیں اس حدیث میں حضور کی بے ادبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا۔ اُن کی ساری کاوشیں صرف اس ایک نقطہ کو معلوم کرنے تک محدود رہیں کہ کیا یہ واقعی فرمانِ رسول ہی ہے۔ اس لیے انہوں نے سب سے پہلے اس حدیث کے روایت کرنے والوں کی سیرت و کردار کو پرکھا اور اس حقیقت کو جاننے کی کوشش کی کہ رواۃ کے ان مختلف سلسلوں میں کہاں کہاں سقم موجود ہے۔ انہوں نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد اس امر کا فیصلہ کیا کہ رواۃ کے اُس سلسلہ کے اعتبار سے جس میں ثابت. انس، اور خالد ابن حماد بن زید (خدا ان سب کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے) شامل ہیں، یہ حدیث مرسل ہے اور ایک دوسرے سلسلہ کے مطابق جو یوسف، ابن عطیہ، اور ثابت کے باہمی ربط سے قائم ہوتا ہے یہ موصول ہے۔ پھر حافظ ابن حجر نے اپنی فاضلانہ تصنیف التلخیص میں رواۃ کے ان مختلف سلسلوں پر پوری طرح بحث کر کے یہ بتایا کہ حدیث "حسن" ہے۔

اسی طرح اس کے متن کی بھی اچھی طرح جانچ پڑتال کی گئی اور ائمہ فن نے بڑے زوردار الفاظ میں اس حقیقت کو ثابت کیا کہ اس حدیث کے پہلے حصے میں تین کا لفظ اگر کہیں شامل ہے تو وہ زائد ہے کیونکہ اس لفظ کا اضافہ اس کے معنی کو مجروح کر دیتا ہے۔ یہ تنقید اتنی بے لاگ ہے کہ اس میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جیسے صالح اور متقی بزرگ کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا اور اس معاملے میں اُن سے جو فروگزاشت ہوئی ہے اُس کی طرف بھی نہایت واضح الفاظ میں بغیر کسی رعایت کے اشارہ کر دیا گیا ہے۔ پھر حافظ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس رائے کی بنیاد بھی بتائی ہے۔ اور کہا ہے کہ تین کا لفظ اس حدیث میں اس لیے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ نماز سے حضور نے آنکھوں کی ٹھنڈک کہا ہے، اس کا شمار دنیا کی پسندیدہ چیزوں میں نہیں کیا جا سکتا۔

"تنقیدی جائزوں" کے ان دو مختلف نمونوں میں ہر ذہین آدمی نقطۂ نظر کے اُس

اختلاف کو بادنیٰ تامل سمجھ سکتا ہے جو ان دونوں گروہوں کے مابین پایا جاتا ہے پہلے گروہ کے نزدیک جو ذہناً بیمار ہے یہ حدیث معاذ اللہ سرور کائنات کی ہوس کاری پر دلالت کرتی ہے اور دوسرے کے نزدیک اس سے حضورؐ کی زندگی کے بعض اہم پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے "عاشقانِ رسولؐ" کے جب روایات پر تبصرے دیکھنے میں آتے ہیں تو میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا ان روایات کے جمع کرنے والوں میں کوئی بھی محبِّ رسول نہ تھا۔ وہ معاذ اللہ سب کے سب رسول اللہؐ کے دشمن ہی تھے۔ اس لیے انہوں نے حضورؐ کے خلاف طرح طرح کی الزام تراشیاں کیں؟ نیک اور خدا ترس لوگوں کے اس ہجوم میں کسی کے دل میں یہ احساس پیدا نہ ہوا کہ اس حدیث سے حضورؐ کے استخفاف کا پہلو نکلتا ہے؟ اور اگر اس چیز کو کسی نے محسوس کیا تو وہ دورِ جدید کے مغرب پرست ہیں؟ کیا حضورؐ کے صحابہؓ میں سے کوئی بھی حضورؐ کا خیر خواہ نہ تھا جو حضورؐ کے ازدواجی تعلقات کی صحیح تصویر پیش کرتا یا کم از کم انہیں اخفا میں رکھتا؟ پھر امام بخاری، مسلم، ابن ماجہ، نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور اسی طرح کے بے شمار ائمہ حدیث میں کسی ایک کو بھی یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ اس نوعیت کی احادیث کو اپنے اپنے مجموعوں میں سے خارج کر کے حضورؐ کی عزت کو بچا لیتے؟ آخر حافظ ابن حجر، دارقطنی اور امام نووی کو کیا ہوا کہ انہوں نے سند کے ہر سلسلے پر کڑی سے کڑی تنقید کی، ہر راوی کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر بڑی احتیاط سے پرکھا اور حدیث کے ایک ایک حرف پر ہر پہلو سے غور کیا مگر ان ساری احادیث کو جن سے حضورؐ کا استخفاف ہوتا ہے انہوں نے بلا چون و چرا قبول کر لیا؟ کیا امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیم کو بھی اس بات کا خیال نہ آیا کہ ان عجمی سازشوں کا جن سے حضور سرورِ دو عالم کی عزت پر حرف آتا ہے، پردہ چاک کیا جائے اور اس طرح حضورؐ کی عفت و عصمت کی حفاظت اور پاسبانی کی جائے؟ آخر ان روایات کے متعلق یہ احساس مغربی استیلاء کے بعد ہی کیوں غیر معمولی حد تک بیدار ہوا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ائمہ سلف کے قلوب چونکہ ہر لحاظ سے صحت مند تھے اس لیے انہیں

حضورؐ کی ازدواجی زندگی کے کسی پہلو میں کوئی سقم نظر نہ آتا تھا۔ وہ اسے بھی حضورؐ سرورِ دو عالم کی حیاتِ طیبہ کے باقی گوشوں کی طرح ہر اعتبار سے پاک اور منزہ سمجھتے تھے۔ اُن کا ذہن بیمار نہ تھا کہ وہ اس میں کیڑے نکالتے اس لیے انہوں نے ان روایات میں استخفاف کا کوئی پہلو نہ دیکھا۔ یہ استخفاف کا احساس بذاتِ خود ایک غلط نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے۔ اور فکر و نظر کے اسی اختلاف میں ایک انسان کی سیرت و کردار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ حضور سرورؐ دو عالم کو جب معراج ہوا اور آپ نے ان مشاہدات کا تذکرہ مختلف لوگوں سے کیا، تو جو لوگ ذہنی لحاظ سے علیل تھے انہوں نے اس واقعہ کو "دروغ گوئی" سمجھ کر حضور کا مذاق اڑانا چاہا لیکن جن لوگوں کے دل و دماغ ایمان کے نور سے منور تھے جنہیں خدا پر پورا پورا یقین تھا، جو حضورؐ کی صداقت کے پوری طرح قائل تھے اور حضورؐ کی سیرت پر کامل بھروسہ رکھتے تھے انہیں اس غیر معمولی واقعہ میں کوئی خلافِ عقل بات نظر نہ آئی۔ وہ حضورؐ کو ان رفعتوں کا ہر لحاظ سے مستحق سمجھتے تھے اس لیے یہی ایک واقعہ اگر کج فہم ابوجہل اور اُس کے بدطینت ساتھیوں کے لیے مذاق کا موضوع تھا تو دوسری طرف سلیم الفطرت ابوبکر صدیق اور اُن کے مقدس رفقاء کار کے لیے یہ ایمان کے بڑھانے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوا۔ قرآن مجید نے فکر و نظر کی اسی صحت کو ایک دوسرے انداز سے واضح فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۔ (البقرہ)	ہاں، اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیلیں دے۔ جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں، وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے اور جو ماننے والے نہیں ہیں، وہ انہیں سُن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں

سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو

راہِ راست دکھا دیتا ہے۔ اور گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں۔

آخر میں ہم یہ گزارش کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر محض مستشرقین کے اعتراضات کی وجہ سے نظرِ ثانی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے تو پھر قرآن مجید کی بھی خیر نہیں۔ کیونکہ مستشرقین نے قرآن مجید پر بھی بیشمار اعتراضات کیے ہیں۔ نزولِ قرآن، اس کی ترتیب، اسلوبِ بیان اور اس کی تعلیمات میں سے کونسی ایسی چیز ہے جو ان کی زد سے محفوظ رہی ہے۔ اور جس نوعیت کے اعتراضات سے گھبرا کر آپ روایات میں کتر بیونت کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ کر رہے ہیں بالکل اُسی نوعیت کے اعتراضات قرآن پر بھی کیے گئے ہیں۔ تو کیا پھر قرآن پاک میں بھی اُن کے ذوق کی رعایت سے ترمیم و تنسیخ کرنا گوارا کریں گے تاکہ انہیں خاموش کیا جا سکے؟ ہم اس طرزِ عمل کے نتائج سے پوری طرح واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر اس ذہنی پسپائی کو ایک مرتبہ قبول کر لیا گیا تو پھر ہمارے لیے کوئی بھی جائے فرار باقی نہیں رہے گی کیونکہ قرآن مجید کا کوئی حصہ ان مستشرقین کی گرفت سے بچ نہیں سکا۔ ان صفحات میں نہ تو اتنی گنجائش ہے کہ ان کے اعتراضات کو پوری طرح بیان کیا جائے اور نہ ہی ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں۔ یہاں ہم صرف چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جن سے معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

> "قرآن مجید میں جنات کا جو تذکرہ موجود ہے وہ ایرانی، یہودی اور مقامی توہمات کا ملغوبہ ہے۔ یہ تصورات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ذہن کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ انہوں نے جو کچھ یہودیوں، عیسائیوں، اور دوسرے ذرائع سے سنا اس میں اپنے ذاتی عقائد کو داخل کر کے اُسے وحی کا نام دے دیا۔"
>
> (القرآن مترجم پامر ص۵۲)

قرآن مجید میں جنت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اُس کے ایک ایک جزو پر ان مستشرقین نے اعتراض کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کا خدا نعوذ باللہ بڑا ہوس کار ہے"۔ اور اُس نے

اپنے چاہنے والوں کو اُن کے اچھے اعمال کی آخرت میں جزا دینے کا جو وعدہ کیا ہے اُس میں نفس کی لذت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس سلسلہ میں اسی پامر کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

"مسلمانوں کے تصورِ بہشت کے حسی پہلو پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خشک اور بے آب و گیاہ سرزمین کے رہنے والوں کے خوابوں کی تعبیر کے علاوہ کچھ ہی زائد ہے۔ (صٓ)

اسی ضمن میں مندرجہ ذیل استدلال بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"خدا کی دوسری صفت یعنی اُس کی جباریت پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک خدا انسانوں کا اور اس کائنات کا خالق ہے ایک مسلمان کی نظر میں خدا کی جباریت اس کے رحم اور محبت پر غالب ہے۔ اور یہ بات قابلِ فہم بھی ہے کہ ایک عرب جس قسم کے حوصلہ شکن اور کٹھن حالات میں رہتا ہے اُس میں لازمی طور پر خدا کی محبت کے مقابلے میں اُس کی جباریت ہی میں وہ زیادہ کشش محسوس کرے گا۔ (اسلام اور عرب روم لانڈو ص۳)

ان اقتباسات کو جن کی حیثیت مشتے از خروارے کی سی ہے، ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ کیا یہ اعتراضات اپنے اندر اتنا وزن رکھتے ہیں کہ ہم ان پر غور بھی کریں؟ اگر ان کے خوف سے تغیر و تبدل کا ایک مرتبہ سلسلہ شروع ہو گیا تو پھر نہ صرف روایات کے دفاتر نظرِ ثانی کے محتاج ہوں گے بلکہ کلامِ پاک میں بھی ہمہ گیر تبدیلی ناگزیر ہو گی۔ ہمیں مغربی ذوق کی رعایت سے نہ صرف قرآن مجید میں حشر، نشر، جنت، دوزخ، اور فرشتوں کا ذکر خارج کرنا ہو گا بلکہ خود صفاتِ الٰہی میں بھی نمایاں تبدیلیاں کرنا ہوں گی۔

ٹیڑھ اگر نظر کا ہو تو اس کا علاج یہ نہیں ہوا کرتا کہ چیزوں کو محض نظر کی کجی کے لحاظ سے

توڑ پھوڑ کر ٹیڑھا کر دیا جائے تاکہ وہ کسی طرح اُسے صحیح دکھائی دینے لگیں۔ اس قسم کی پاسداری نہ تو دنیا میں ممکن ہے اور نہ ہی صحیح۔ اگر کسی شخص کو ایسے انسان سے فی الواقع ہمدردی ہے تو اس کی مدد کی بہترین صورت یہ ہے کہ کسی طرح اُس کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو درست کیا جائے۔ اس کی نگاہوں کے ہدف کو اُس کی ٹیڑھ کے مطابق تبدیل کرتے رہنا ایک ایسا طرزِ عمل ہے جس کی تائید عقل نہیں کر سکتی۔ اور خصوصاً جب اس ٹیڑھ کو مخصوص مصالح کے تحت جان بوجھ کر پیدا کر لیا جائے تو پھر یہ ایک ایسا مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں بجز اس کے اللہ تعالیٰ خود رحم فرما کر دل کی کجی کو دور فرما دے جس سے فکر و نگاہ کے زاویے خود بخود درست ہو جائیں۔

مستشرقین ہزاروں سالوں سے جس مذہب سے آشنا چلے آ رہے ہیں وہ مسیحیت ہے۔ اس مذہب کی رُو سے ازدواجی تعلق بذاتِ خود ایک گناہ ہے۔ اس لیے ان کی عقل ایک لمحے کے لیے یہ باور نہیں کر سکتی کہ روحانی اعتبار سے ارفع و اعلیٰ انسان کبھی اس میں ملوث ہو سکتا ہے۔ اُن کی نظر میں خدا کا محبوب انسان وہ ہے جو اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیا اور اس کی ساری لذتوں سے یکسر نا آشنا رہے۔

پھر اہلِ مغرب کے بعض مخصوص سیاسی مصالح نے بھی انہیں اسلام کو ہدفِ طعن بنانے پر اُبھارا۔ مسلمانوں کے ساتھ حاکم و محکوم کے تعلقات میں انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ اس قوم کو زندہ رکھنے، اسے آزادی کی جدوجہد پر آمادہ کرنے اور آگے بڑھانے والی اگر کوئی قوت ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں جب تک اسلام کی محبت موجود ہے اس وقت تک انہیں طاقت کے بل بوتے پر کسی حد تک غلام تو رکھا جا سکتا ہے مگر انہیں غلامی پر راضی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اگر انہیں فی الواقع غلامی پر قانع اور مغرب کا تابع مہمل بنانا ہے اور ان کے اندر سے زندگی کی حرارت اور ولولے کو ختم کرنا ہے تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ان کے قلب و دماغ میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق مختلف نوعیت کے شکوک و شبہات پیدا کر دیے جائیں اسکی آسان صورت یہی ہے کہ اُن کی فکر و نگاہ کے زاویے بدل دیے جائیں کیونکہ ان کے تبدیل ہو جانے کے بعد پھر انہیں اسلام کی صحیح صورت بھی ٹیڑھی نظر آنے لگے گی اور اس طرح اُن کا اس دین پر سے خود ہی اعتماد اٹھ جائیگا۔

پاکستان میں عیسائیت کی رفتار ترقی

سید محمد جمیل صاحب

[ذیل کا عبرت انگیز مضمون رسالہ (VOICE OF ISLAM) میں شائع ہوا ہے جس سے یہ المناک حقیقت معلوم ہوگی کہ قیام پاکستان کے بعد ہماری "اسلامی حکومت" کے زیر سایہ عیسائیت کو کتنا فروغ نصیب ہوا ہے اور غیر مسلموں یا پست طبقوں ہی میں نہیں، خود مسلمانوں میں سے کتنی بڑی تعداد کو عیسائی مشنری اسلام سے نکال کر اپنے مذہب میں داخل کر چکے ہیں۔ یہ داستان اگرچہ ہم سب مسلمانانِ پاکستان کے لیے ہی شرمناک ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کو پڑھتے وقت ہمیں ان غیر معمولی رعایات کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے جو ہمارے ملک میں مشنری مدارس اور کالجوں اور ہسپتالوں کو حاصل ہیں، اور ان اثرات کو بھی نہ بھولنا چاہیے جو مسیحی پادریوں کو ہمارے حکام عالی مقام کی بارگاہوں میں حاصل رہے ہیں۔ انگریزی حکومت میں مسلمان مولوی جتنا بے اثر تھا اتنا ہی آج ہماری "اسلامی حکومت" میں بھی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ بے اثر۔ اور اس وقت مسیحی پادری جتنا با اثر تھا اتنا ہی آج ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ با اثر۔ یہی وجہ ہے کہ خود انگریزی حکومت میں بھی عیسائیت کو وہ فروغ نصیب نہ ہوا تھا جو آج اسے نصیب ہو رہا ہے۔]

مسلمانوں کو اپنا دین ہمیشہ سے عزیز، جان سے بھی زیادہ عزیز رہا ہے۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنے دین کی حفاظت کی ہے اور دین کو بچانے کی خاطر اپنی زندگی کو قربان کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا ہے۔ یہ دعویٰ اُن حالات پر بھی پورے طور پر صادق آتا ہے جبکہ مسلمانوں کو اجنبی ممالک میں قلیل تعداد میں زندگی بسر کرنی پڑی ہے یا جب کہ وہ اپنے ملکوں میں اغیار کے

تسلط کا شکار رہے ہیں۔ اسلام اور اس کی حقانی تعلیمات کو اللہ تعالیٰ نے حسن اور دلکشی کا ایک ایسا مرقع بنا دیا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ اپنے نازک ترین ادوار میں بھی ارتداد کے فتنوں سے قریب قریب قطعی طور پر ناآشنا رہی ہے۔ ہماری پوری چودہ صد سالہ قومی زندگی میں ترک اسلام اور ارتداد کے واقعات خال خال اور اِکّا دُکّا ہی دکھائی دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب میں نے کینیڈا کے ایک مسیحی جریدے "پراسپکٹر" کے اکتوبر ۱۹۵۸ء کے شمارے میں یہ رپورٹ پڑھی کہ مسلمان ممالک میں عیسائیت کی اشاعت ترقی کر رہی ہے تو مجھے سخت صدمہ ہوا اور ابتداءً میرا دل اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ یہ رسالہ ایک بین الاقوامی رومن کیتھولک مشنری تنظیم کے زیر اہتمام چھپتا ہے۔ اس تبصرے میں پاکستان کے اندر عیسائیت کے ارتقاء کا بالخصوص مسرت آمیز لہجے میں ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"پاکستان میں چرچ کو اپنے تبلیغی مشن میں عظیم ترین کامیابی حاصل ہوئی ہے اور صرف گزشتہ سال میں آٹھ ہزار مسلمانوں کو بپتسمہ دے کر عیسائی بنایا گیا ہے۔ پاکستان کی مجموعی آبادی سات کروڑ اسی لاکھ ہے جس میں رومن کیتھولک افراد کی تعداد اسی ہزار سے بڑھ کر اب دو لاکھ اٹھاسی ہزار دو سو تریسٹھ تک پہنچ چکی ہے۔" یہ روداد میرے لیے انتہائی تشویش انگیز تھی، اس لیے میں نے چاہا کہ میں اسے صحیح سمجھنے سے پہلے دوسرے ذرائع سے بھی اس کی تصدیق کر لوں۔

میں نے جب اس مسئلے پر تحقیق و تفتیش کی تو مجھے اس موضوع سے متعلق دو بیان دستیاب ہوئے۔ ان میں سے ایک تو انٹرنیشنل کیتھولک المنیک ۱۹۵۸ء کی وہ سرکاری رپورٹ ہے جسے کلیسائی اتھارٹی کی باقاعدہ توثیق حاصل ہے۔ اس میں ۳۰ جون ۱۹۵۷ء تک کے باقاعدہ اعداد و شمار درج ہیں۔ دوسرا بیان پاکستانی عیسائیوں کے ایک نمائندے کا ہے جو دو سال قبل اُن کی طرف سے باضابطہ جاری کیا گیا تھا۔ کیتھولک المنیک میں پاکستان سے متعلق ذیل کا اندراج ہے:۔

"پادری اور مذہبی عہدے دار تین سو سینتیس۳۳۷۔ گرجے ستاسی۸۷۔ مذہبی کارکن سات سو بیاسی۷۸۲۔ مدارس تین سو ستتر۳۷۷۔ طلبہ تریسٹھ ہزار چار سو ساٹھ۶۳۴۶۰۔ دیگر ادارے بہتر۷۲۔ رومن کیتھولک دو لاکھ اڑسٹھ ہزار تین سو بائیس۲۶۸۳۲۲۔"

یہ رپورٹ "پراسپکٹر" والی رپورٹ سے ایک سال پہلے کی ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو پراسپکٹر میں ۱۹۵۸ء کی جو تعداد دو لاکھ اٹھاسی ہزار دو سو تریسٹھ بیان ہوئی ہے وہ بھی درست اور قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ یہ پاکستان کے رومن کیتھولک باشندوں کی تعداد ہے جو علانیہ دن دہاڑے ٹھیک ٹھیک تعین کے ساتھ سرکاری طور پر شائع ہوئی ہے اس میں کسی طرح کی غلطی یا مبالغہ آمیزی کا امکان موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں دوسرا بیان جو مجھے ملا ہے وہ مسٹر انیتھونی ڈی سوزا کا ہے جو انہوں نے دو سال قبل دیا تھا۔ صاحب موصوف پاکستانی عیسائیوں کے نمائندے اور ایک ذمہ دار سرکاری ملازم ہیں۔ وہ اپنے بیان میں کہتے ہیں:

> "عیسائی اقلیت آج صرف بڑے شہروں اور قصبوں ہی میں سرگرم کار نہیں ہے بلکہ پورے ملک کے دیہات میں بلکہ جھونپڑوں تک میں عیسائی ٹیچر، ڈاکٹر، نرسیں اور قانون دان موجود ہیں اور مغربی پاکستان میں عیسائیوں کے پورے پورے گاؤں وجود میں آچکے ہیں۔"

یہ حقائق اور اعداد و شمار ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ ہر شخص انہیں بچشم سر دیکھ سکتا ہے۔ اب میرے لیے اس سوال کا جواب دینا قطعاً غیر ضروری ہے کہ عیسائی چرچ نے "اگر مسلمانوں کو عیسائیت سے ہم آغوش کرنے میں نمایاں ترین کامیابی حاصل کی ہے" تو یہ امر پاکستانی مسلمانوں کے لیے اور جن لوگوں نے گزشتہ دس سال تک یہاں حکمرانی کی ہے ان کے لیے باعث فخر ہے یا باعث شرم؟ ہماری گزشتہ تاریخ تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب کبھی ملت اسلامیہ کا ایک فرد بھی دائرۂ اسلام سے نکلتا تھا یا اس کے نکلنے کے امکانات پیدا ہوتے تھے تو پوری

ملت برانگیختہ ہو جاتی اور کرب و اذیت سے تلملا اٹھتی تھی۔ ہماری یہی کیفیت اُس دور میں بھی قائم اور برقرار تھی جب ہم انگریزوں کے تسلط میں جکڑے ہوئے تھے۔ ہم انگریزی حکومت سے ہمیشہ اس لیے لڑتے رہے کہ وہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی سرپرستی کرتی ہے۔ ہر شخص کو معلوم ہے کہ سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" میں یہ بات واضح طور پر ثابت کردی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کا براہِ راست تعلق اس امر سے بھی تھا کہ حکومت دینی معاملات میں مداخلت کرتی تھی۔ چنانچہ ملکہ وکٹوریہ کو اپنے ۱۸۵۸ء کے مشہور اعلان میں مذہبی غیر جانبداری کی صراحت کرنی پڑی۔ اب اگر ہماری آزادی کے بعد کلیسا اُپنی عظیم ترین کامیابی" کا مخربہ اظہار کر رہا ہے تو ہر سچے مسلمان کے دل پر چوٹ لگنی چاہیے اور اُس کی گردن ندامت سے جھک جانی چاہیے۔ یہ چیز ہمارے دینی احساسات، ہمارے ملی استحکام اور ہمارے اسلامی جذبات کے لیے ایک کھُلے کھُلے چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ مجھے یہ بات ایک ناقابلِ یقین تضاد معلوم ہوتی تھی کہ ہمارے تیرہ سالہ دورِ آزادی میں اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنے والوں کی تعداد ہمارے دوصد سالہ دورِ غلامی میں عیسائی ہونے والوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہے! اس صورتِ حال کا تصوّر میرے سکونِ قلب کو تہ و بالا کرنے اور مجھے مبتلائے رنج و الم کرنے کے لیے بالکل کافی تھا۔

معاملے کی نزاکت اور سنگینی اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ اس کے مختلف پہلوؤں کا غیر جذباتی طریق پر مطالعہ کیا جائے اور متعلقہ حقائق اور اسباب و نتائج پر تفصیلی نگاہ ڈالی جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ مردم شماری سے حاصل شدہ معلومات کا ضلع وار اور صوبہ وار معائنہ کیا جائے۔ مزید برآں یہ بھی لازم تھا کہ مشنری سوسائٹیوں کا لٹریچر فراہم کیا جائے اور اُن کے تبلیغی مراکز سے ربط قائم کر کے معلومات حاصل کی جائیں۔ تقابلی مطالعے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ دیارِ ملحقہ ـــ بالخصوص ہندوستان ـــ کے حالات کا بھی اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے

اس سارے مواد کی فراہمی خاصا مشکل کام تھا۔ ہمارے ہاں اچھی لائبریریوں اور مطالعہ کی سہولتوں کا فقدان ہے اور تاجرانِ کتب کے ہاں سنجیدہ اور کارآمد کتابوں کا ملنا آسان نہیں ہے۔ تاہم رفتہ رفتہ مجھے کچھ نہ کچھ مواد میسر ہو گیا ہے اور اپنی تحقیقات کے نتائج سے میں اپنے مسلمان بھائیوں کو آگاہ کر رہا ہوں۔

تقسیم سے قبل کے ہندوستان کے متعلق اعداد و شمار یہ ثابت کرتے ہیں کہ قریب ڈیڑھ صدی کی مسیحی تبلیغی جدوجہد اور مسلمانوں کی اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی ناکہ بندی کے باوجود ۱۸۸۱ء تک ہندوستان کے پچاس ہزار عیسائیوں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جسے دائرۂ اسلام سے نکال کر عیسائیت میں داخل کیا جا سکا ہو۔ صرف یہی نہیں کہ اس پورے عرصے میں کوئی مسلمان عیسائی نہیں ہوا، بلکہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں اور ان خطوں میں جہاں اسلامی تہذیب کا غلبہ تھا، وہاں دوسرے غیر مسلموں میں سے بھی کچھ بہت زیادہ لوگ مشنریوں کی تبلیغ سے متاثر نہیں ہوتے۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری صاف بتاتی ہے کہ اُس وقت متحدہ ہندوستان کے شمالی خطے میں — جو پشاور اور کراچی سے لے کر ڈھاکہ اور شیلانگ تک پھیلا ہوا تھا — عیسائیوں کا تناسب تین ہزار میں ایک اور بعض جگہ اس سے بھی کم تھا۔ پورے غیر منقسم پنجاب بشمول دہلی میں عیسائی صرف تین ہزار تین سو اکیاون (۳۳۵۱) تھے، جو عیسائیوں کی ہر طرح کی کوششوں کا ثمرہ تھے۔ حساب لگا کر دیکھا جائے تو ان خطوں میں گویا عیسائی ایک فی پانچ ہزار بھی نہ تھے۔ ۱۹۰۱ء تک بھی شمال مغربی سرحدی صوبے میں عیسائی پانسو اسّی (۵۸۰) سے زائد تعداد میں نہ تھے۔ بلوچستان اور کراچی کو چھوڑ کر باقی سارے سندھ میں ان کی تعداد سرحدی صوبے کی تعداد سے بھی کم تھی۔ اس وقت پورے جموں و کشمیر میں ہندوستانی عیسائی صرف دو سو دو (۲۰۲) تھے۔ ان اعداد و شمار میں مرد، عورت، بچے سب شامل ہیں۔ اس زمانے میں برما، بمبئی، مدراس اور سیلون کو چھوڑ کر بقیہ پورے ہندوستان میں عیسائیوں کی گنتی چار لاکھ سے زائد نہ تھی۔ گویا کہ ان علاقوں میں بھی عیسائی اور غیر عیسائی کا تناسب ۱ : ۵۰۰ تھا۔ (باقی صفحہ ۶۳ پر)

ارض القرآن کا سفر

از جناب محمد عاصم صاحب

(۸)

[اس روداد کی قسط ماہ دسمبر ۱۹۶۰ء میں "الندوہ" (مکہ معظمہ) کے نمائندۂ ریاض کے حوالے سے میں نے یہ روایت نقل کی تھی کہ ۱۹۵۸ء میں حج کے موقع پر لائل پور اور لاہور کے دو علماء نے مولانا مودودی کے خلاف اس عجیب و غریب الزام کا تائید کی تھی کہ وہ حدیث و فقہ کے منکر ہیں۔ اس پر حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کا ایک خط مدیر ترجمان القرآن کے نام موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے اور اس کی تردید کا مطالبہ کیا ہے۔ ہمارے لیے اس سلسلہ میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ نمائندۂ الندوہ نے تین مرتبہ بتاکید ہم سے یہ روایت بیان کی تھی اور ہم سے کہا تھا کہ میں نے یہ بات خود ان دونوں صاحبوں سے سنی ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ یہ روایت غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟ ــــ م۔ ع]

طائف کے آثار ہمارا اگلا سارا دن (۵ دسمبر) طائف کے آثار دیکھنے میں صرف ہوا۔ صبح ۹ بجے کے قریب ایک ترکستانی دوست احمد جان صاحب اپنی جیپ لے کر ہماری قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ اس میں ہم سب سے پہلے وہ راستہ دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہجرتِ مدینہ سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنو ثقیف پر اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے اسی راستے سے طائف تشریف لائے تھے۔ یہ راستہ طائف سے وادیٔ ہدا، کراء، شدّاد

اور عرفات سے ہوتا ہوا مکہ معظمہ جاتا ہے۔ کئی سال سے اس پر پختہ سڑک بنانے کا کام ہو رہا ہے۔ کراء طائف اور مکہ معظمہ کے تقریباً وسط میں ایک نہایت بلند پہاڑ ہے اُس وقت اس پہاڑ پر دونوں طرف سے سڑک بن چکی تھی، صرف اس پہاڑ کو کاٹ کر راستہ بنانے کا کام باقی تھا اور یہ کام بڑے زور شور سے ہو رہا تھا۔ ہم اس جگہ تک گئے، جہاں پہاڑ کو کاٹا جا رہا تھا۔ طائف سے کراء تک کافی بلند پہاڑی علاقہ ہے، لیکن کراء کے بعد یک لخت گویا میدان آ جاتا ہے اور مکہ معظمہ تک زمین کی بلندی یکساں رہتی ہے۔ پہاڑ پر کھڑے ہو کر وہ سڑک بہت ہی نیچے نظر آ رہی تھی جو شداد اور عرفات سے ہوتی ہوئی مکہ معظمہ کو جاتی ہے لوگوں کا اندازہ تھا کہ یہ کام آئندہ چھ ماہ تک مکمل ہو جائے گا، لیکن ابھی تک اس کی خبر اخبارات میں نہیں آئی۔ یہ راستہ مکمل ہو جائے تو طائف اور مکہ معظمہ کے درمیان صرف ۶۵ کیلو میٹر (۴۰ میل کے قریب) کی مسافت رہ جائے گی، جبکہ موجودہ راستہ سے یہ مسافت ۱۲۰ کیلو میٹر (۷۵ میل کے قریب) ہے۔ طائف اب بھی بڑا اور اہم شہر ہے، لیکن اس راستہ کے مکمل ہو جانے کے بعد اس کی وسعت اور اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ ایک طرف جدہ اور مکہ معظمہ سے اس کا براہِ راست تعلق قائم ہو جائے گا اور دوسری طرف نجد اور عُمان و مسقط وغیرہ کی طرف سے مکہ معظمہ آنے والوں کے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ اس راستہ کے مکمل ہو جانے کے بعد سعودی حکومت کا ارادہ طائف اور ریاض کے درمیان سڑک کو بھی پختہ کر دینے کا ہے۔

طائف سے کراء اور کراء سے مکہ معظمہ، جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں، وہ راستہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف تشریف لائے۔ اب بھی پیدل اور اونٹ کے ذریعے سفر کرنے والے اسی راستہ سے آتے جاتے ہیں۔ کراء پر اونٹ کے چڑھنے اور اُترنے کا راستہ بنا ہوا ہے اور غالباً عباسی دور ہی کا بنا ہوا ہے۔

کراء کے راستہ میں ایک وادی آتی ہے جسے وادی مُحرِم کہتے ہیں۔ اسے وادی محرم

اس لیے کہتے ہیں کہ فتح طائف کے بعد مکہ معظمہ جاتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں سے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ ہیکل نے اپنی کتاب "فی منزل الوحی" میں اسی کو قرن المنازل لکھا ہے معلوم نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے؟ اب یہاں ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے اور یہاں چھوٹا سا قصبہ بھی ہے۔ وادی محرم کے بعد ایک دوسری وادی آتی ہے جسے وادی ہدّا کہتے ہیں۔ یہ نہایت سرسبز وادی ہے۔ یہاں بھی بستی ہے اور کھیتی باڑی بھی ہوتی ہے۔ واپسی میں ہم یہاں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرے اور ایک مدرسہ میں پانی پیا۔ کہتے ہیں کہ یہاں سے بھی ایک راستہ وادی ثلبیہ اور شرائع سے ہوتا ہوا مکہ معظمہ جاتا ہے اور یہ وہ راستہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلی مرتبہ (جب کہ آپ بنو ثقیف پر دعوت حق پیش کرنے کے لیے طائف تشریف لائے تھے اور طائف کے سرداروں نے نہ صرف آپ کی دعوت قبول نہیں کی تھی بلکہ آپ کو سخت زخمی کیا تھا، طائف سے مکہ معظمہ واپس ہوئے تھے۔ اب بھی پیدل یا اونٹ کے ذریعے سفر کرنے والے لوگ اسی راستہ سے سفر کرتے ہیں۔

دوپہر کے قریب ہم کراء سے طائف واپس آتے ہوتے مثناۃ گئے جو موجودہ طائف سے ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر جنوب مغرب کی طرف ایک چھوٹی سی بستی ہے اور طائف ہی کا ایک حصہ شمار کی جاتی ہے۔ یہ بستی اس جگہ واقع ہے جس کے قریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اصل طائف آباد تھا، اس لیے ہماری دلچسپی کے آثار بھی یہیں تھے۔ ایک خاص چیز جو ہم نے یہاں پہنچ کر محسوس کی، وہ یہ کہ یہاں اگرچہ اچھی خاصی آبادی ہے اور باغ، مکان اور گلیاں نہایت شاندار بنی ہوئی ہیں، لیکن یہاں کوئی آدمی ہمیں نظر نہیں آیا، گویا پوری بستی شہر خموشاں ہے۔ یہ چیز ہم ہی نے محسوس نہیں کی، بلکہ بعد میں جب میں نے ہیکل کی کتاب "فی منزل الوحی" دیکھی تو انہوں نے بھی اس میں یہاں کی بے رونقی اور سنسان پن کا ذکر کیا ہے۔ کیا یہ ایک نبی اور وہ بھی خاتم النبیین اور سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ٹھکراتے اور انہیں اذیت پہنچانے کی پھٹکار تو نہیں ہے؟

یہاں دو باغوں میں دو چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنی ہوئی ہیں، جن میں سے ایک کو مسجد علی کہتے ہیں اور دوسری کو مسجد الحبشی۔ یہ دونوں بالکل غیر آباد ہیں۔ ان میں سے مسجد علی کو جو ایک باغ کے دروازے کے ساتھ بنی ہوئی ہے، ہم نے کھولا تو محسوس ہوا کہ گویا مدتِ دراز سے نہ کسی نے اس مسجد کو کھولا ہے اور نہ یہاں جھاڑو دی ہے۔ اذان اور نماز باجماعت کا تو سوال ہی کیا؟ دوسری مسجد یعنی مسجد الحبشی ایک باغ کے اندر بنی ہوئی ہے۔ اس تک تو پہنچنا بھی آسان نہیں۔ ہم نے باغ کی دیوار پر چڑھ کر باہر ہی سے اسے دیکھا۔

ان دونوں مسجدوں میں سے ایک مسجد بہرحال اس جگہ بنائی گئی ہے جہاں زخمی ہونے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) نے آرام فرمایا اور جہاں عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے نصرانی غلام سیدنا عداس ؓ نے آپ کی خدمت میں انگور لا کر پیش کیے لیکن یہ مسجد کونسی ہے۔ اس کے متعلق ہمارے ساتھ جو لوگ تھے، قطعی بات نہیں کہہ سکے، اور نہ خود بستی میں تلاش کے باوجود ہمیں کوئی ایسا آدمی مل سکا، جو اس بارے میں کوئی قطعی بات کہہ سکتا۔ ہیکل نے اپنی کتاب میں جس مسجد عداس کا ذکر کیا ہے، وہ غالباً مسجد علی ہی ہے۔

دونوں مسجدوں کے درمیان ایک کچا راستہ مشرق سے مغرب کو جاتا ہے، جسے وادی وج کہتے ہیں۔ یہ کافی لمبی وادی ہے۔ کہتے ہیں کہ طائف کے محاصرہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صحابۂ کرام کو جمع کرکے ان کی صف بندی فرمائی تھی۔

اس کے بعد ہمارے ساتھی ثنناۃ ہی میں ہمیں ایک اور جگہ لے گئے۔ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے جسے مسجد کوع کہتے ہیں اور اس کے ساتھ پہاڑ پر ایک بڑا پتھر اس طرح رکھا ہوا ہے گویا لٹک رہا ہے اور زمین پر پہنچنے سے صرف نصف گز کے فاصلہ پر رک گیا ہے۔ طائف کے لوگوں میں مشہور رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس پہاڑ کے دامن میں آرام فرما رہے تھے کہ اوپر سے کفار نے یہ بڑا پتھر آپ پر لڑھکا دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے اس کو رک جانے کا حکم دیا، تو وہ جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ ہمیں تو یہ بات

سراسر افسانہ معلوم ہوئی۔ اس کا ذکر سیرت کی معتبر کتابوں میں نہیں ملتا۔

عصر کے بعد ہم طائف کی ایک اور مسجد دیکھنے کے لیے گئے، جسے مسجد ابن عباس کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت وسیع اور پرانی بنی ہوئی مسجد ہے۔ اس کی دائیں طرف ایک حجرے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی قبر ہے، جس پر تالا لگا ہوا ہے اور کوئی شخص اسے جھانک کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اب اس مسجد کے ساتھ سامنے کی طرف ایک دوسری شاندار مسجد نئے طرز پر بن رہی ہے۔

مسجد ابن عباسؓ کے محلِ وقوع کو دیکھتے ہوئے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد اس جگہ بنی ہوئی ہے، جہاں محاصرۂ طائف کے موقع پر مسلمانوں کا لشکر ٹھہرا تھا اور جنگ ہوئی تھی۔ اس کے بالکل سامنے جنوب مغرب میں ان صحابۂ کرام کی قبریں ہیں جو غزوۂ طائف میں شہید ہوتے۔ لوگوں نے ہمیں بتایا کہ پہلے ان قبروں پر کتبے بھی لگے ہوئے تھے، لیکن اب یہ کتبے مٹا دیئے گئے۔

مسجد ابن عباس کے سامنے مغرب کی جانب تھوڑے فاصلہ پر ایک قلعہ کے آثار ہیں، جو غالباً پرانے قلعہ طائف ہی کے مقام پر ہیں۔ اگرچہ موجودہ آثار بنو ثقیف کے پرانے قلعہ کے نہیں ہیں، لیکن غالباً جگہ وہی ہے، خصوصاً جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ لگانے اور لشکرِ اسلامی کے ٹھہرنے کی جگہ اور قبورِ شہداء اس کے قریب واقع ہیں۔

مسجد ابن عباسؓ کے پاس سڑک پر پتھر کا ایک بڑا سا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ جس کے متعلق طائف کے لوگوں میں مشہور رہے کہ یہ لات (وہ بت جس کی بنو ثقیف پوجا کرتے تھے اور بعد میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسے توڑ ڈالا تھا) کا ٹکڑا ہے، مگر اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

مسجد ابن عباسؓ، قبورِ شہداء اور قلعہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ ایک اور مسجد میں آئے جو طائف کے کئی بازاروں کے درمیان واقع ہے اور کافی وسیع اور پرانی بنی ہوئی ہے۔ اسے مسجد الہادی کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جگہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے صحابہ کرامؓ کو وعظ فرمایا تھا اور اسی لیے اس جگہ جو مسجد بعد میں بنائی گئی اُسے مسجد الہادی نام دیا گیا۔ ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کی۔

ترک حضرات کی دعوت رات کو عشاء کے بعد ترک حضرات نے ایک جگہ ہماری دعوت کا اہتمام کیا تھا، جس میں ان کے اکثر بزرگ اور علماء موجود تھے۔ اس بہانے ہمیں ان کے ساتھ اطمینان سے مل بیٹھنے اور ان کے حالات سننے کا موقع ملا۔ بیچارے بڑی ہی تکلیف اور کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ اگرچہ انہیں سعودی عرب میں رہتے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے مگر ابھی تک انہیں تابعیہ (مستقل شہریت) نہیں دیا گیا، جس کی وجہ سے انہیں آئے دن دفتروں اور تھانوں کا چکر لگانا پڑتا ہے۔ اور ہر حال اپنی مدتِ اقامت بڑھوانے کے لیے ۴۰، ۴۲ ریال فی کس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ جب تک تابعیہ نہ ہو وہ عرب میں کسی جگہ شادی نہیں کر سکتے، بلکہ اگر ان کا کوئی آدمی مر جائے تو عام قبرستان میں دفنانے میں بھی بڑی رکاوٹیں اور دقتیں پیش آتی ہیں۔ چینی ترکستان کے مہاجرین کو اس بات پر بھی مجبور کیا گیا کہ وہ چینی سفیر سے پاسپورٹ لیں اور پھر یہاں ویزا لے کر جب تک ویزا کی توسیع ہوتی رہے مقیم رہیں۔ مسلمان حکومتوں کے لیے مغربی تصورِ قومیت کی یہ تقلید اسلامی تصورات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اگر کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مسلمان اپنے دین اور آبرو کو بچانے کے لیے اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوں تو آخر وہ مسلمان ملکوں میں پناہ نہ ڈھونڈیں تو اور کہاں ڈھونڈیں اور مسلمان ملک بھی انہیں پناہ نہ دیں تو ایمان کا رشتۂ اخوت پھر کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ ترکستانی مہاجر درحقیقت اس زمانے کے تمام مہاجرین سے زیادہ ہمدردی اور ہر قسم کی امداد کے مستحق تھے۔ اور لوگوں کی ہجرت میں تو کوئی دوسرا جذبہ بھی کارفرما ہو سکتا ہے لیکن ان کی ہجرت کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں اسلام ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا اور کمیونسٹوں کے غلبہ کے بعد وہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے اپنے دین کو محفوظ نہ رکھ سکتے تھے۔ ایسے حالات میں انہیں سب سے بڑھ کر مسلمان ملکوں میں امان ملنی چاہیے تھی لیکن افسوس

ہے کہ افغانستان، ایران، ٹرکی، عرب، کہیں بھی ان سے وہ معاملہ نہیں برتا گیا جو اسلامی برادری کے شایانِ شان ہو۔

ترک حضرات کے کھانے عربوں سے مختلف اور ہمارے ہاں سے کافی مشابہ ہیں۔ ان کے متعلق خاص طور پر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ لوگ دن رات میں کسی وقت پینے کے لیے پانی استعمال نہیں کرتے، نہ سردیوں میں اور نہ گرمیوں میں، پینے کے لیے ہمیشہ چائے استعمال کرتے ہیں اور وہ بھی بغیر دودھ اور بغیر شکر کے۔ ہم لوگوں کے لیے شکر اور دودھ کا خاص طور پر انہوں نے اہتمام کیا تھا

طائف سے واپسی | اگلے روز (۶ دسمبر) صبح ۱۰ بجے کے قریب ہم طائف سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ بہت سے ترک حضرات شہر سے باہر بہت دُور تک ہمیں الوداع کہنے کے لیے ساتھ آئے۔ یقیناً ان لوگوں کی محبت، اخلاص اور مہمان نوازی ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

موقع عکاظ | حوایا (طائف کا ہوائی اڈہ) کے قریب سڑک سے دائیں طرف ایک کھلی وادی نظر آئی، جس کے متعلق اکثر محققین کا خیال ہے کہ سُوق عُکاظ اس وادی میں لگا کرتا تھا۔ بعض محققین اس کا موقع سیل کبیر میں اور بعض دوسری جگہوں پر بتاتے ہیں۔

حنین | سیل کبیر پر پہنچ کر ہم نے عمرہ کا احرام باندھا اور کچھ دیر وہاں رک کر آگے روانہ ہوئے۔ طائف جاتے ہوئے ہمارا ڈرائیور بالکل جاہل تھا، اس لیے وہ راستہ کی کوئی چیز ہمیں نہ بتا سکا۔ آتے ہوئے جو ڈرائیور ملا، وہ قدرے پڑھا لکھا تھا۔ زَیمہ اور شرائع کے درمیان سڑک کی دائیں طرف ایک کھلے میدان کے متعلق اس نے ہمیں بتایا کہ غزوۂ حنین یہاں واقع ہوا تھا۔ ہم نے موٹر سے اتر کر اس کی متعدد تصویریں لیں۔ افسوس یہاں بھی کوئی علامت موجود نہیں ہے۔

ظہر کے وقت ہم مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ اپنی جائے قیام پر سامان رکھ کر عمرہ کے لیے نکلے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب اس سے فارغ ہو کر واپس قیام گاہ پر آئے تو دروازے پر

محمد عالم صاحب عطرجی کے ایک آدمی کو کھڑا پایا۔ طائف جانے سے پہلے محمد عالم صاحب سے یہ طے پایا تھا کہ ہم جس روز مکہ معظمہ واپس آئیں گے، اس روز رات کا کھانا ان کے ہاں کھائیں گے، لیکن شاید انہیں غلط فہمی ہوئی اور وہ دوپہر کے کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے اس لیے فوراً ہی کپڑے بدل کر ہمیں ان کے ہاں جانا پڑا۔

حُدَیبیہ اگلے روز (۷ دسمبر) عصر کے بعد ہم شیخ سلیمان الصنیع اور شیخ عقیل عطاس کے ساتھ مسجد حُدَیبیہ دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ مسجد، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، مکہ معظمہ اور جدّہ کے درمیان سڑک کے عین کنارے واقع ہے۔ مکہ معظمہ سے اس کا فاصلہ ۲۲ کیلومیٹر (تقریباً ۱۲½ میل) ہے۔ یہ مسجد اس مقام پر واقع ہے جہاں صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہؓ کرام کا لشکر ٹھہرا تھا۔ اس کی موجودہ عمارت ۱۲۵۵ھ کی بنی ہوئی ہے۔ ۱۳۶۱ھ میں (یعنی آج سے ۱۹ سال پیشتر) اس کی مرمت ہوئی۔ اس کے اندر محراب کے پاس ایک کتبہ لگا ہوا ہے، جس پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے:

بسم الرحمٰن الرحیم
کلما دخل علیہا زکریا
} سفید تختہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ھٰذا مسجد الرضوان
مأثرة من مآثر جیب المنان
عمّره المنتقل الی رحمة الرحمان
المغفور لہ السلطان محمد۔۔خان
۱۲۵۵ھ
} سیاہ تختہ

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک
۔۔۔۔۔ رمم ھذا المسجد سنة ۱۳۶۱ھ
} سفید تختہ

اس مسجد کی بائیں طرف وہ راستہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر مکہ معظمہ تشریف لائے تھے یہ راستہ وادی فاطمہ کو جاتا ہے، جو ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی ہے جدہ شہر کو سارا پانی اسی وادی سے مہیا کیا جاتا ہے۔ اس کا قدیم اور اصل نام مرالظہران ہے۔

اصل مسجد کے قریب لشکر کے لیے لوہے کے چھپروں کی ایک اور مسجد بنی ہوئی ہے ساتھ ہی ایک چار دیواری کے اندر شمیسی گاؤں کے لوگوں کا قبرستان ہے شمیسی اس گاؤں کا جدید نام ہے۔ اس کا اصل اور قدیم نام حدیبیہ ہے، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔

ہم نے مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کی اور پھر مکہ معظمہ واپس آگئے۔

استاذ احمد علی و استاذ سعید العامودی رات کو عشا کے بعد استاذ احمد علی اور استاذ سعید العامودی مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ استاذ احمد علی مکہ معظمہ کے کلیۃ الشریعہ کے مدیر (پرنسپل) ہیں۔ ادب اور تاریخ سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔ مکہ معظمہ کے "المنہل" (ماہنامہ) اور "الحج" (ماہنامہ) میں ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے والد ہندوستان ہی کے رہنے والے تھے اور بعد میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے۔ استاذ احمد علی کی پیدائش مکہ معظمہ ہی میں ہوئی لیکن گھر کے ماحول کی وجہ سے اردو اچھی خاصی جانتے ہیں۔ مولانا سے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں گفتگو کرتے رہے۔ ان دنوں "آل سعود" نامی ان کی ایک کتاب تازہ تازہ شائع ہوئی تھی، اس لیے انہوں نے اس کا ایک ایک نسخہ مولانا، چودھری صاحب اور مجھے بطور ہدیہ پیش فرمایا۔ استاذ سعید العامودی "الحج" کے ایڈیٹر ہیں اور بہت ہی سنجیدہ اور سمجھدار آدمی ہیں۔ ان کی ادارت سے پہلے "الحج" ایک معمولی پرچہ تھا، جس میں زیادہ تر مضامین حج ہی سے متعلق ہوا کرتے تھے یا پھر حکومت کے اعلانات شائع ہوتے تھے، لیکن اب یہ ایک اعلیٰ درجہ کا علمی پرچہ بن گیا ہے۔ ان دونوں حضرات سے "دنیا میں دعوتِ اسلامی کی کامیابی کے امکانات" پر گفتگو رہی۔ ہمارے پاس مولانا کی عربی کتابوں میں سے چند کتابیں تھیں، وہ ہم نے انہیں پیش کیں اور باقی بعد میں دمشق سے بھجوا دیں۔

جدہ واپسی ظہر کی نماز کے بعد ہم نے طواف وداع کیا پھر جدہ کے لیے روانہ ہوئے اور عصر کے قریب وہاں پہنچ گئے رات گئے تک مختلف پاکستانی اور عرب دوست ملاقات کے لیے آتے رہے۔ آنے والوں میں ایک صاحب شیخ احمد سلیمان العشماوی بھی تھے، جو شیخ مصطفیٰ عالم کی طرح دراصل مصری ہیں۔ ان کا تعلق بھی اخوان سے تھا، اس لیے جیل میں بھی رہے، لیکن جیل سے رہا ہوتے ہی حج کے لیے مکہ معظمہ چلے آئے اور اب انہوں نے جدہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔

مصری سفارت خانہ اگلے دن (۹ دسمبر) چودھری غلام محمد صاحب مصری سفارت خانے گئے۔ میری طبیعت جدہ پہنچتے ہی بہت خراب ہو گئی تھی، اس لیے میں بھی ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ ہماری پہلی ملاقات کے بعد مصری سفیر نے ہمارے متعلق اپنی حکومت کو تار دیا تھا۔ وہاں سے ان کے نام وزارتِ مواصلات اور وزارتِ خارجہ کا مشترک تار آیا کہ وہ ہمارا خوشی استقبال کریں گے اور جزیرہ نما سینا کے سفر میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں گے اور یہ بھی لکھا کہ سفیر انہیں ہمارے پہنچنے کی اطلاع دیں۔

شیخ محمد نصیف کی دعوت اگلے دن (۱۰ دسمبر) دوپہر کے وقت شیخ محمد نصیف کے ہاں مولانا کے اعزاز میں دعوت تھی۔ مولانا اور چودھری صاحب وہاں گئے۔ میں اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ دعوت میں جن حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں مستشار السفیر المغربی (سفیر مراکش کے ایڈوائزر) بھی تھے۔ مغرب عربی (مراکش) کے لوگ وہاں کے ماہنامہ "دعوۃ الحق" میں مولانا کے مضامین کی وجہ سے مولانا سے اچھی طرح واقف ہیں، چنانچہ دعوۃ الحق کا ایک تازہ پرچہ جس میں مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، مستشار صاحب نے مولانا کو دیا۔

جدہ ریڈیو کو انٹرویو عصر کے قریب عبداللہ عباس ندوی (جو سعودی ریڈیو جدہ میں اردو پروگرام کے ذمہ دار ہیں)، ہماری جائے قیام پر آئے۔ انہوں نے مولانا سے اردو میں

چند سوالات کیے اور مولانا نے ان کے جوابات دیے۔ ان سوالات وجوابات کو مکالمہ کی شکل میں ٹیپ ریکارڈ کر لیا گیا، اور انہیں اگلے دن اردو میں اور اس سے اگلے دن عربی میں ریڈیو سے نشر کیا گیا۔[1]

جدہ کے اسلام پسند نوجوانوں کا اجتماع جدہ میں ایسے نوجوانوں کا اچھا خاصا حلقہ ہے جو حسن بنا شہیدؒ اور مولانا مودودی کی کتابیں پڑھتے ہوئے اور ان سے متاثر ہیں۔ ان لوگوں نے مولانا کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رکھی تھی، چنانچہ عشا کے بعد مولانا ان کے ہاں گئے۔ میری طبیعت ابھی تک خراب تھی۔ اتفاق سے چودھری صاحب کو بھی اس روز زکام ہو گیا، اس لیے ہم دونوں مولانا کے ساتھ نہ جا سکے۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد مولانا واپس تشریف لائے۔ وہاں کے متعلق دوسری باتوں کے علاوہ جو خاص بات مولانا نے بیان فرمائی وہ یہ تھی کہ اس اجتماع میں محکمہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ملک میں عرب قومیت کے تعصب، مغربی تہذیب اور اخلاقی انحطاط کے دن بدن بڑھنے اور پھیلنے کی سخت شکایت کی۔ مصر سے ایک ہفتہ وار پرچہ "المصور" شائع ہوتا ہے جس کے صرف دو مقصد ہیں۔ ایک عرب ملکوں میں اپنی حکومت کا پروپیگنڈا کرنا اور دوسرا، نوجوانوں میں فحش مضامین و برہنہ تصاویر کے ذریعے بے دینی اور بداخلاقی پھیلانا۔ ان صاحب کے بیان کے مطابق صرف سعودی عرب کے اندر اس کے پچاس ہزار نسخے ہر ماہ درآمد ہوتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ جب یہ کسی شہر میں پہنچتا ہے تو ہاکر کی دکان پر نوجوان خریداروں کا تانتا بندھا ہوتا ہے۔ بعض نوجوان تو اس کے لیے اس قدر بے تاب ہوتے ہیں کہ انہوں نے اس کی قیمت پیشگی ادا کی ہوتی ہے بلکہ ان کے نام سے ہاکر کی دکان میں پوسٹ بکس کی طرح بکس بنے ہوتے ہیں کہ جونہی یہ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے گندے پرچے اس کے ہاں پہنچیں، ان کے لیے فوراً مخصوص کر دیے جائیں۔ ان ہی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ عرب قومیت کی ستائش میں شاعر "القروی" کا مشہور قصیدہ پہلی بار اسی "المصور" میں شائع ہوا تھا۔ جس وقت یہ پرچہ سعودی عرب

[1] یہ سوالات وجوابات "چراغ راہ" فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ جگہ کی کمی کے باعث ترجمان القرآن کی اس قسط میں نہیں دیے جا سکے۔ ان شاء اللہ اس سفرنامہ کو کتابی شکل میں شائع کرتے وقت انہیں شامل کر دیا جائے گا۔ (م - ع)

میں پہنچا تو مفتیٔ اکبر شیخ محمد بن ابراہیم کی طرف سے مراقبہ (سنسر) والوں کے نام حکم جاری ہوا کہ آئندہ سے سعودی عرب کے اندر اس پرچے کا داخلہ بند کر دیا جائے، مگر مراقبہ والوں نے یہ کہہ کر تعمیلِ حکم سے انکار کر دیا کہ جب تک مجلس الوزراء (کیبنٹ) کی طرف سے حکم نامہ نہیں آئے گا اس کا داخلہ بند نہیں کیا جا سکتا، مگر آج تک نہ حکم نامہ آیا اور نہ اس پرچے کا داخلہ بند ہوا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سعودی عرب میں قدیم اور جدید یا دوسرے الفاظ میں دینی و غیر دینی رجحانات رکھنے والوں کے درمیان کشمکش اندر ہی اندر کس زور سے چل رہی ہے۔

اگلے دن (۱۱ر دسمبر) جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے جدہ کی سب سے بڑی مسجد باحفوظ میں پڑھی، جس کے خطیب ایک سوڈانی عالم شیخ محجوب ہیں۔ شیخ احمد سلیمان العشماوی بھی موجود تھے۔ خطبہ کے بعد انہوں نے لوگوں کو مولانا کی تقریر سننے کے لیے بٹھا لیا اور مولانا کا تعارف کرایا۔ مولانا نے معذرت کرنا چاہی، مگر چند منٹ تک عربی میں برجستہ بولنا ہی پڑا۔ عرب حضرات بولنے کے بڑے دھنی ہیں، آپ جب چاہیں، جس عرب کو پکڑ کر کھڑا کر دیں، وہ تقریر کر ڈالے گا۔ مولانا کے بعد شیخ احمد سلیمان العشماوی اور شیخ مصطفیٰ عالم وغیرہ نے تقریریں کیں۔ مسجد سے ہم شیخ احمد سلیمان العشماوی کے ہاں گئے اور وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے پر عدن کے ایک دوست عمر طرموم سے ملاقات ہوئی، جو دو روز پہلے اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں جدہ آئے تھے۔ عدن میں جو لوگ وہاں کے مشہور عالم شیخ سالم البیحانی کی نگرانی اور تربیت میں دعوتِ اسلامی کا کام کرتے ہیں، عمر طرموم ان میں سے ایک ہیں۔ ان سے مل کر عدن کے حالات معلوم ہوتے۔

جدہ میں "انجمن خدامِ حجاج" کے نام سے ایک انجمن قائم ہے جس کے تمام کارکن ہندوستان یا پاکستان کے باشندے ہیں۔ ان لوگوں نے مولانا سے تقریر کی درخواست کی، جسے مولانا نے منظور کر لیا۔ چنانچہ اسی روز مغرب کے بعد یہ تقریر ہوئی۔ پہلے انجمن کے صدر جناب اے۔ جی۔ نہال صاحب (عبدالغفار خاں صاحب) نے استقبالیہ تقریر کی۔ پھر تقریباً ایک گھنٹہ تک مولانا

نے تقریر کی۔ تقریر کا موضوع حالات کی مناسبت سے "سعودی عرب میں اسلام کے لیے کام کرنے والوں کی ذمہ داریاں" تھا۔ ساری تقریر ٹیپ ریکارڈ کی گئی۔ ڈیڑھ دو سو کے قریب حضرات کی حاضری تھی۔ بعد میں سوالات کا سلسلہ بھی ہوا۔[1]

عرب قومیت اور پاکستان اگلے دن (۱۲ دسمبر) کوئی خاص پروگرام نہیں رہا۔ صرف مختلف احباب سے ملاقاتیں رہیں۔ ملاقات کے لیے آنے والوں میں پاکستانی بھی تھے اور عرب بھی۔ عرب نوجوانوں سے دوسرے مسائل کے علاوہ عرب قومیت کے موضوع پر خاص طور پر گفتگو رہتی تھی۔

استاذ محمد احمد باشمیل مکہ معظمہ کے ایک خالص اسلامی طرز فکر رکھنے والے ادیب ہیں حال ہی میں ان کی ایک کتاب "القومیۃ فی نظر الاسلام" شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے عرب قومیت کی خوب خوب خبر لی ہے اور اس کے نقصانات اور خطرناک نتائج سے عرب نوجوانوں کو خبردار کیا ہے۔ سنا ہے کہ اس کتاب نے شائع ہوتے ہی پورے سعودی عرب میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بہت سے نوجوان عرب قومیت سے تائب ہو رہے ہیں۔ اس وقت تک اس کے پانچ ہزار نسخے نکل چکے ہیں اور اب مصنف نے دس ہزار اور چھپوائی ہے اس کتاب میں محمد احمد باشمیل نے مولانا کا نام لیے بغیر وہ بحث نقل کی ہے، جو ان کے اور عرب

---

[1] یہی وہ تقریر تھی جس کا میں نے نومبر کی قسط میں قارئین سے وعدہ کیا تھا۔ اس تقریر کا ٹیپ ریکارڈ کراچی پہنچ گیا تھا، اس لیے خیال تھا کہ اسے نقل کر کے اس مہینے کی قسط میں شائع کر دیا جائے گا، مگر آخر وقت میں معلوم ہوا کہ جو ٹیپ ریکارڈ کراچی پہنچا ہے وہ ناقص ہے اور اس سے تقریر کا نقل کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ ہم جدہ کے احباب سے دریافت کریں کہ آیا ان کے پاس تقریر کا کوئی صاف ٹیپ ریکارڈ ہے کہ نہیں؟ اور اگر ہو تو ان سے درخواست کریں کہ وہ اسے نقل کر کے ہمیں بھیج دیں۔ اگر اس سکیم کے مطابق تقریر کی نقل ہمیں مل گئی تو اسے انشاء اللہ اس سفر نامہ کو کتابی شکل میں شائع کرتے وقت شامل کر دیا جائے گا۔ امید ہے اس کوتاہی پر قارئین ہمیں معاف فرمائیں گے۔ (م۔ع)

قومیت سے متاثر ایک نوجوان کے درمیان ہوئی۔ اس نوجوان نے مولانا سے سوال کیا کہ آپ پاکستانی حضرات نے عربوں کے قومی معاملات میں کیا کیا ہے؟ مولانا نے اس سوال کا جواب یہ دیا کہ "ہم نے اپنے عرب بھائیوں کے مسائل میں ہمیشہ ان کی تائید کی ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے، لیکن اس تائید کی بنیاد آپ لوگوں کا یہ نعرہ نہیں ہے جسے آپ عرب قومیت، عرب قومیت کے نام سے لگا رہے ہیں، بلکہ اس کی بنیاد وہ دینی رابطہ ہے جو ہمارے اور آپ کے درمیان اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ آپ حضرات اس دینی رابطہ کو ختم کرنے کے درپے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اب تک اس کی پاسداری کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے، اس نے نہ صرف فلسطین اور الجزائر بلکہ عربوں کے تمام دوسرے مسائل میں ان کی پوری تائید کی ہے۔ لیکن آپ حضرات کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہر قوم جو ایک خاص ملک میں رہتی ہے، اس کے کچھ اپنے مسائل بھی ہوتے ہیں، جن سے اسے بہر حال نپٹنا ہوتا ہے۔ اگر آپ لوگوں کو فلسطین اور الجزائر یا دوسرے مسائل درپیش ہیں تو ہم پاکستانیوں کے لیے بھی کشمیر کا مسئلہ درپیش ہے۔ اگر یہودیوں نے آپ کے دس لاکھ افراد کو قتل اور جلاوطن کیا ہے تو ہندوؤں نے ہمارے ایک کروڑ کے قریب افراد کو قتل اور جلاوطن کیا ہے اور اب تک ہندوستان اور کشمیر میں ان کے ظلم وستم کا سلسلہ جاری ہے۔ آپ لوگ اپنی یادداشت پر زور ڈال کر ذرا مجھے بتائیے کہ اس پورے المیہ میں آپ لوگوں نے ہماری کہاں تک تائید کی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ اس کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔ لہٰذا میں خود ہی اس کا جواب دیتا ہوں۔ آپ لوگوں نے ہماری مدد یوں کی ہے کہ جب ہندوستان و کشمیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی تو آپ لوگوں نے اپنی زبانوں پر قفل چڑھا لیے۔ آپ کے اخبارات نے اس کی مذمت میں چند سطروں تک کے لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے مقابلے میں پاکستان کے تمام اخبارات نے آپ لوگوں پر کسی طرف سے جو بھی زیادتی ہوئی، اس کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور اب تک کر رہے ہیں۔ کاش آپ لوگوں کی کرم فرمائی

یہیں تک محدود رہ جاتی، مگر آپ نے اثباتی غیر جانبداری اور امن و سلامتی کے علمبردار (ابطال الحیاد الایجابی و رسل السلام) کا لقب دیتے ہوئے ان لوگوں کی طرف دوستی و محبت کا ہاتھ بڑھایا جن کے ہاتھ اب تک مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ کاش ہندوستان کو آپ لوگوں کی دوستی کا واقعی پاس ہوتا، مگر اس نے آپ کو کوئی وقعت نہ دیتے ہوئے اسرائیل کو تسلیم کیا اور اب تک اسے تسلیم کیے ہوتے ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان نے اب تک نہ اسرائیل کو تسلیم کیا ہے اور نہ کبھی اسرائیل کے کسی باشندے کو اپنی سرزمین میں قدم رکھنے کی اجازت دی ہے۔ سوچیے! اگر خدانخواستہ آپ لوگوں کی ضد میں آکر ہم لوگ بھی اسرائیل کو تسلیم کرلیں اور اس کے ساتھ دوستی و محبت کے روابط پیدا کرنے لگیں، اور بن گوریان کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دیں اور اس کے لیے رسول السلام کے نعرے لگا کر اس کا استقبال کریں، تو کیا اس صورت میں آپ لوگ ہمیں کچھ بھی ملامت کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ لیکن نہیں، ہرگز نہیں، میں تو اسے آپ لوگوں کے سامنے ایک مفروضہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں۔ ورنہ ہم پاکستانی مسلمان اس کا خیال تک دل میں نہیں لاسکتے، اس لیے کہ ہمارا دین ہمیں اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا لہٰذا مجھے امید ہے کہ اس مفروضہ کے ذکر سے میں نے آپ لوگوں کی دل آزاری نہیں کی ہوگی"۔

باشمیل صاحب نے اس ساری گفتگو کو نقل کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں کشمیر کے مسئلے اور ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب کا ذکر کیا ہے اور عرب سیاست دانوں کو شرم دلائی ہے کہ انہوں نے آج تک کبھی ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کیا

جدہ سے مدینہ منورہ | ۱۳ دسمبر کی صبح ۸½ بجے ہم جدہ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اگرچہ ہم تین آدمی تھے، لیکن سامان زیادہ ہونے کی وجہ سے ہمیں سات سیٹوں والی ٹیکسی لینی پڑی، جس کا ہم نے ۱۲۵ ریال کرایہ ادا کیا۔

جدہ سے مدینہ منورہ کے درمیان ۴۲۵ کیلو میٹر (۲۶۵ میل) کا فاصلہ ہے۔ سڑک نئی بنی ہوئی ہے اور نہایت عمدہ ہے اور اس کی حفاظت اور مرمت کا بھی پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے

سب سے پہلی بستی جو ہمارے راستے میں آئی، وہ دُعْسَان تھی۔ اس کے بعد تَوَل اور قضیمہ کی بستیاں آئیں۔ موٹروں سے پہلے جب لوگ پیدل یا اونٹوں پر سفر کیا کرتے تھے تو مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ جانے والے مسافر جدہ نہیں آیا کرتے تھے، بلکہ قضیمہ پہنچ کر مشرق کی طرف مڑ جاتے تھے اور پھر عُسفان اور شُمَیسی (حدیبیہ) یا عُسفان اور وادیٔ فاطمہ (مرالظہران) کے راستے سے مکہ معظمہ پہنچتے تھے۔ ممکن ہے اونٹوں پر سفر کرنے والے مسافر اب بھی اس راستہ سے آتے جاتے ہوں، لیکن موٹریں اس راستہ پر نہیں چلتیں۔ اس کے بعد ہم رابغ پہنچے، جو بحرِ قلزم پر ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے اور مصر و شام کی طرف سے آنے والے حاجی یہیں سے حج یا عمرہ کا احرام باندھتے ہیں۔ ۶۰ کیلومیٹر اور چلنے کے بعد ہم مَستُورہ پہنچے۔ مستورہ تک ــــ جو جدہ سے ۱۷۱ کیلومیٹر ہے۔ گویا ہم بحرِ قلزم کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے، لیکن اس کے بعد سڑک دائیں طرف یعنی مشرق کو مڑ گئی۔ تقریباً ۸۰ کیلومیٹر اور چلنے کے بعد ہم مفرق پہنچے۔ یہاں سے ایک سڑک مدینہ منورہ کو جاتی ہے اور دوسری یَنبُع کو، جو بحرِ قلزم پر ایک بندرگاہ ہے اور یہیں مصر و شام کے وہ حاجی آکر اترتے ہیں، جو حج سے پہلے مدینہ منورہ آنا چاہتے ہیں۔ مفرق کا فاصلہ مدینہ سے ۱۵۵ کیلومیٹر اور جدہ سے ۲۶۹ کیلومیٹر ہے۔ جدہ سے آتے ہوئے یہاں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ۷ کیلومیٹر اور چلنے کے بعد ہم ½۱۱ بجے کے قریب بدر پہنچ گئے۔

بدر ہم نے بدر میں تین گھنٹے قیام کیا۔ اس اثنا میں ایک مقامی آدمی کو ساتھ لیکر ہم وہ مقام بھی دیکھنے گئے، جہاں معرکۂ بدر پیش آیا تھا۔ یہ مقام بدر کی بستی سے دو کیلومیٹر (½۱ میل) پر مغرب کی طرف واقع ہے، وہاں ایک چھوٹے سے احاطہ میں ۱۳ شہدائے بدر مدفون ہیں، اور قریب ہی اہلِ بدر کا موجودہ قبرستان بھی ہے۔ اس جگہ پہنچنے کے لیے مدینہ منورہ کی طرف سے آنے والے کو دائیں جانب اور جدہ کی طرف سے آنے والے کو بائیں طرف مڑنا ہوتا ہے۔

یہ مقام یعنی بدر مفرق سے ۷ کیلومیٹر ہے، جہاں سے ینبع سے آنے والی سڑک مدینہ سے آنے والی سڑک سے مل جاتی ہے۔ کفار کا قافلہ جو شام سے آرہا تھا، وہ اس سڑک سے

مکہ کی طرف چلا گیا اور کفار کا لشکر آگے بڑھ کر بدر کے مقام پر اس لیے ٹھہر گیا کہ مسلمانوں کا راستہ روک سکے۔ شہداء کی قبریں جس جگہ واقع ہیں، وہاں اب کوئی نشان نہیں ہے، صرف ایک حوض ہے جس کے چاروں طرف منڈیر بنی ہوئی ہے۔ جو مقامی آدمی ہمارے ساتھ تھا اس کی مدد سے ہم نے العدوۃ القصوی، العدوۃ الدنیا اور کفار اور صحابۂ کرامؓ کے آنے کی سمتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ظہر کی نماز پڑھ کر ۲½ بجے کے قریب ہم بدر سے روانہ ہوئے اور الواسطہ، الحمراء، مسیجید اور بئر علی ہوتے ہوئے عصر اور مغرب کے درمیان مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ بئر علی (جو مدینہ منورہ سے صرف پانچ میل ہے) کا قدیم نام ذوالحلیفہ ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں سے حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے حج کا احرام باندھا تھا۔ اہلِ مدینہ کا اب بھی یہی میقات ہے۔ راستے میں ہمیں بہت سی ایسی بستیاں بھی نظر آئیں، جن میں کچے مکان اور کھجور کے اُجڑے ہوئے باغ تو موجود تھے، لیکن آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ عرب کی آبادی کس تیز رفتاری سے گاؤں چھوڑ چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہو رہی ہے اور کس طرح پٹرول کی وجہ سے ملک کی زراعت دن بدن تباہ ہوتی جا رہی ہے۔

مدینہ وصولی مدینہ منورہ میں ہم نے فندق قصر المدینہ (مدینہ پیلس ہوٹل) میں قیام کیا جو مسجد نبوی سے متصل صاف ستھرا ہوٹل ہے۔ مغرب کی نماز ہم نے حرم میں ادا کی اور پھر سلام کے لیے حاضری دی۔ عشاء کی نماز کے بعد مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی دعوت پر ان کے ہاں کھانے پر گئے۔ مولانا بدر عالم صاحب کو چند ماہ پہلے موٹر کا ایک سخت حادثہ پیش آ گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی ایک انگلی بھی کٹ گئی تھی اور ایک بازو بھی پوری طرح کام نہ کر رہا تھا۔ اللہ کرے اب وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکے ہوں۔

مسجد نبوی اب کی مرتبہ مدینہ منورہ ہمیں نہایت کھلا اور صاف ستھرا شہر نظر آیا۔ ۱۹۵۶ء

میں حج کے بعد جب ہم یہاں آئے تھے، تو مسجد نبوی کی توسیع و تعمیر اور اس کے ارد گرد مکانات کو گرا کر نئی سڑکیں اور راستے بنانے کا سلسلہ جاری تھا۔ اب یہ سارا کام مکمل ہو چکا تھا۔ نئی توسیع و تعمیر کے بعد مسجد نبوی نہایت خوبصورت و شاندار بھی ہو چکی ہے اور اس کا رقبہ بھی پہلے کی نسبت ڈیوڑھا بلکہ ڈیوڑھے سے بھی زیادہ ہو چکا ہے۔ اس کے ارد گرد ہر طرف کافی کھلا اور پختہ راستہ چھوڑا گیا ہے تاکہ مسجد میں آنے اور اس سے نکلنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ موٹروں کے آنے اور ٹھہرنے کے لیے پیچھے یعنی شمال کی جانب کھلا میدان رکھا گیا ہے، اس طرح موٹروں کے شور کا بھی مسجد میں نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے والوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مدینہ منورہ میں تین چار ہوٹل ہیں، جو سب کے سب نئے اور مسجد کے قریب ہی بنے ہوئے ہیں۔ مکہ معظمہ کے ہوٹل حرم سے کافی فاصلہ پر ہیں۔

مدینہ منورہ کا موسم مدینہ منورہ میں جدہ اور مکہ معظمہ کی نسبت کافی سردی تھی لیکن ہمارے ہاں لاہور کے برابر نہ تھی۔ تاہم رات کو وضو کے لیے ہمیں گرم پانی استعمال کرنا اور کمرے کے دروازے بند کر کے سونا پڑتا تھا۔

امیر مدینہ سے ملاقات اگلے دن (۱۴ اردسمبر) صبح کے وقت میں اور چودھری صاحب مدینہ منورہ کے گورنر (امیر المدینہ) کے دفتر گئے۔ مدینہ کے گورنر ضابطہ کے لحاظ سے شاہی خاندان کے ایک شہزادہ ہیں، لیکن وہ عملاً سارا سال نجد میں رہتے ہیں۔ ان کے وکیل (سکرٹری)، عبداللہ السّدیری ان کی جگہ تمام فرائض انجام دیتے ہیں، اس لیے عموماً ان ہی کو امیر المدینہ کہا جاتا ہے۔ سُدیری نجد کا ایک بہت ہی بارسوخ خاندان ہے۔ سعودی خاندان کی اس سے رشتہ داریاں بھی ہیں، اس لیے اس کے بہت سے افراد کئی جگہوں مثلاً تبوک، وجہ اور حائل کے امیر یا وکیل الامیر ہیں۔ مدینہ میں جس عمارت میں امیر کا دفتر ہے وہ بہت ہی خستہ اور پرانے طرز کی عمارت ہے۔ اس کی اب تک قسمت نہ جاگنے پر ہمیں بڑا تعجب ہوا۔ امیر عبداللہ السدیری سے ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کے وکیل۔ جو

ان کے بڑے صاحبزادے ہیں ــــ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مغرب کے بعد مولانا کو اپنے والد کے ہاں آنے کی دعوت دی۔ مغرب کے بعد ہم ان کے ہاں گئے۔ بہت ہی سادہ لیکن باخبر قسم کے آدمی معلوم ہوتے۔ اسلامی آثار کی حفاظت سے غفلت پر افسوس ظاہر کرتے رہے اور اس کے مقابلے میں یورپ اور امریکہ والے جس طرح اپنے آثار کی حفاظت کرتے ہیں اس پر رشک کرتے رہے۔ انہوں نے ہمیں آئندہ سفر کے سلسلے میں ہر قسم کی سہولت پہنچانے کا یقین دلایا۔ ہمیں اور کسی قسم کی مدد کی ضرورت نہ تھی، البتہ ہمارا آئندہ سفر چونکہ ایک ایسے علاقے میں ہونا تھا، جس سے ہم بالکل ناواقف تھے اور جس میں ذرائع آمد و رفت کا انتظام بطور خود کرنا ناممکن تھا، اس لیے ہم نے ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ کسی موٹر والے سے ہمارا معاملہ طے کرا دیں جو بحساب فی یوم ہم سے اپنی موٹر کا کرایہ وصول کرے اور ہمارے ساتھ اس وقت تک رہے جب تک ہم سعودی مملکت سے نکل کر اردن میں داخل نہ ہو جائیں۔ امیر نے نہ صرف پولیس انسپکٹر کے ذریعے ایسا ڈرائیور تلاش کرنے کا وعدہ کیا بلکہ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ اپنا ایک آدمی بھی دوں گا جو اس وقت تک آپ کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے ساتھ رہے گا جب تک آپ اردن میں داخل نہیں ہو جائیں گے اس پر ہم نے امیر کا شکریہ ادا کیا۔

ملاقاتیں عصر کے بعد محمد زین الشنقیطی اور ان کے دوست حبیب الرحمٰن الباکستانی سے ملاقات ہوئی محمد زین صاحب ایک ذی علم اور گہرا اسلامی جذبہ رکھنے والے نوجوان ہیں۔ یہ اصل میں شنقیط[1] کے رہنے والے ہیں، لیکن تعلیم کی غرض سے گزشتہ پندرہ سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور اب سعودی ہو چکے ہیں۔ اس وقت مدینہ منورہ کے سرکاری یتیم خانے ــــ دار الایتام والضائع ــــ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان سے ہمارا تعارف

---

[1] شنقیط مراکش کی اس ریاست کا نام ہے جسے حال میں فرانس نے موریطانیہ کے نام سے مراکش سے الگ ایک مستقل ریاست بنا دیا ہے۔

پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں ہوا، جبکہ انہوں نے مولانا مودودی کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے لیے پیش کیا تھا، لیکن پاکستان سے باہر کسی کو رکن بنانا چونکہ جماعت کی پالیسی نہیں تھی اس لیے یہ جماعت کے رکن تو نہ ہوسکے، لیکن ان سے تعلقات اور مراسلت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ مدینہ منورہ میں جن لوگوں نے مولانا کی کتابیں پڑھی ہیں انہیں ان کتابوں سے روشناس کرانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ ان کے ساتھی حبیب الرحمٰن صاحب دراصل بلوچستان کے رہنے والے ہیں، لیکن کئی سال سے مدینہ منورہ ہی میں مقیم ہیں اور اب سعودی ہو چکے ہیں۔ یہ بھی محمد زین صاحب کے ساتھ دارالایتام میں مدرس ہیں۔

اس روز جن دوسرے حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں ایک ترکستانی عالم شیخ قاسم اندجانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ترکستانی مہاجر ہیں۔ ہجرت کر کے پہلے ہندوستان آئے لیکن بعد میں مستقل طور پر مدینہ منورہ چلے آئے اور اب دارالایتام ہی میں مدرس ہیں۔ ترکستان کے حالات پر انہوں نے عربی اور ترکستانی زبان میں بعض کتابیں بھی لکھی ہیں، لیکن حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اب تک شائع نہیں ہو سکیں۔

اسی روز حرم میں عراق کے مشہور عالم شیخ امجد الزہاوی سے بھی ملاقات ہوئی۔ عراق کی حالت اور اس میں کمیونسٹوں کے ظلم و تشدد اور خرمستیوں کا ذکر کرتے رہے۔ ان کے اندازِ گفتگو سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ عراق کے حالات کا ان کے ذہن پر سخت بُرا اثر پڑا ہے۔ عراق سے حج کے ارادے سے حجاز تو آ گئے تھے، لیکن واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے جہاں تک ہو سکا انہیں صبر و تحمل کے ساتھ حالات کا انتظار کرنے کی تلقین کی۔

(باقی)

اعتذار

ترجمان القرآن (جنوری ۱۹۶۱ء) کے شمارہ میں صفحات ۲۲۴-۲۲۵ کی ترتیب غلطی سے آگے پیچھے ہو گئی ہے۔ اس کے لیے ادارہ قارئین سے معذرت خواہ ہے

(منیجر)

رسائل و مسائل

ایصالِ ثواب، قرآن و حدیث کا باہمی تعلق اور چند دیگر مسائل

سوال: مندرجہ ذیل امور میں آپ کی رہنمائی درکار ہے مجھے امید ہے کہ آپ حسبِ معمول واضح جواب عنایت فرما دیں گے۔

(۱) رسائل و مسائل حصہ دوم صفحہ ۲۹۶ پر "نذر و نیاز اور ایصال ثواب" کے عنوان کے تحت جو جواب آپ نے رقم فرمایا ہے اس سے یہ تبادر ہوتا ہے کہ آپ اس امر کے قائل ہیں کہ مالی عبادت سے ایصالِ ثواب ہو سکتا ہے مگر بدنی عبادت سے نہیں۔ اور پھر آپ مالی انفاق کے بھی متوفیٰ عزیز کے لیے نافع ہونے کو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف قرار دے رہے ہیں۔ کیا آپ کے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اس امر کی بابت کوئی صراحت قرآن و حدیث میں نہیں ہے کہ بدنی عبادت میں ایصالِ ثواب ممکن ہے؟ یا کوئی اور سبب ہے؟

آپ خود ایصالِ ثواب کرنے والے کے لیے تو انفاق کو بہر حال نافع قرار دے رہے ہیں مگر متوفی عزیز کیلئے نافع ہونے کو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف قرار دے رہے ہیں۔ اس تفریق کی اصل وجہ کیا ہے؟

(۲) کیا ہر شخص ہر دوسرے متوفی شخص کو (خواہ متوفی اس کا عزیز ہو یا نہ ہو، یا متوفی نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی تربیت میں حصہ لیا ہو یا نہ) مالی انفاق کا ثواب پہنچا سکتا ہے یا کہ اس کے لیے آپ کے نزدیک چند قیود و شرائط ہیں؟ ازراہِ کرم اپنی رائے سے تحریر فرما دیں۔

(۳) رسائل و مسائل حصہ دوم صفحہ ۶۲-۶۳ پیراگراف اول میں آپ نے لکھا ہے

" قرآن میں اگر کوئی حکم عموم کے انداز میں بیان ہوا ہو اور حدیث یہ بتائے کہ اس حکم عام کا اطلاق کن خاص صورتوں پر ہوگا تو یہ قرآن کے حکم کی نفی نہیں ہے بلکہ اس کی تشریح ہے۔ اس تشریح کو اگر آپ قرآن کے خلاف ٹھہرا کر رد کر دیں گے تو اس سے بے شمار قباحتیں پیدا ہونگی جن کی مثالیں آپ کے سامنے پیش کروں تو آپ خود مان جائیں گے کہ فی الواقع یہ اصرار غلطی ہے "

اگر آپ اس عبارت کے آخر میں چند مثالیں اس امر کی پیش فرماتے تو مستفسر کو مزید تشفی ہو جاتی۔ مجھے چند ایسی امثلہ کی ضرورت ہے جس سے ایک منکر حدیث مان جائے کہ ایسا کرنے سے (تشریح کو قرآن کے خلاف ٹھہرانے سے) فی الواقعہ قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ بہتر ہوگا اگر آپ چار مثالیں مہیا فرما دیں۔

(۴) میں اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ حدیث قرآن کی وضاحت کرتی ہے مگر میں کسی حکم کے قرآن میں نہ ہونے اور خلافِ قرآن ہونے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ازراہِ کرم آپ چار امثلہ ایسی پیش فرما دیں جس سے میرے لیے دونوں باتوں (خط کشیدہ) کا فرق پوری طرح واضح ہو جائے۔

(۵) کیا اگر کسی گناہ (مثلاً زنا) کی شرعی سزا ایک شخص کو اسلامی حکومت کی جانب سے مل جائے تو وہ آخرت میں اس گناہ کی سزا سے بری ہو جائیگا یا کہ نہیں؟

(۶) کیا حدیث یا قرآن میں کوئی اصولی ہدایت اس امر کی موجود ہے کہ ہر شخص اپنی قوم (ذات) میں ہی شادی کرے۔ واضح رہے کہ میں کفاءت کا اس معنی میں تو قائل ہوں کہ فریقین میں مناسبت ہونی چاہیے غیر ضروری معیار کا فرق نہیں ہونا چاہیے۔

جواب - آپ کے سوالات کے مختصر جوابات نمبر وار درج ذیل ہیں :

در اصل تو قرآن و حدیث سے عام قاعدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا اپنا عمل ہی اس کے لیے مفید ہے، ایک شخص کا عمل دوسرے کے لیے آخرت میں مفید نہ ہوگا۔ لیکن بعض احادیث سے یہ استثنائی صورت بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایصالِ ثواب کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی جتنی احادیث بھی ہمیں ملی ہیں ان سب میں کسی خالص بدنی عبادت کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایسی عبادت کا ذکر ہے جو یا تو صرف مالی عبادت ہے جیسے صدقہ، یا مالی و بدنی عبادت ملی جلی ہے، جیسے حج۔ اسی بنا پر فقہاء میں اختلاف ہوا ہے۔ ایک گروہ اسے مالی اور بدنی عبادات دونوں میں جاری کرتا ہے اور دوسرا گروہ اس کو ان عبادات کے لیے مخصوص کرتا ہے جو یا تو خالص مالی عبادات ہیں یا جن میں بدنی عبادت مالی عبادت کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک یہ دوسرا مسلک اس لیے مرجح ہے کہ قاعدۂ کلیہ میں اگر کوئی استثناء کسی حکم سے نکلتا ہو تو اس استثناء کو اسی حد تک محدود رکھنا چاہیے جس حد تک وہ حکم سے نکلتا ہے۔ اسے عام کرنا میری رائے میں درست نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص پہلے گروہ کے مسلک پر عمل کرتا ہے تو اسے ملامت نہیں کی جا سکتی کیونکہ شریعت میں اس کی گنجائش بھی پائی جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اختلاف صرف ترجیح کا ہے

رہی یہ بات کہ ایصالِ ثواب کا میت کے لیے نافع ہونا یا نہ ہونا اللہ کی مرضی پر موقوف ہے، تو اس کا سبب در اصل یہ ہے کہ ایصالِ ثواب کی نوعیت محض ایک دعا کی ہے۔ یعنی ہم اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ یہ نیک عمل جو ہم نے تیری رضا کے لیے کیا ہے اس کا ثواب فلاں مرحوم کو دیا جائے۔ اس دعا کی حیثیت ہماری دوسری دعاؤں سے مختلف نہیں ہے۔ اور ہماری سب دعائیں اللہ کی مرضی پر موقوف ہیں۔ وہ مختار ہے کہ جس دعا کو چاہے قبول فرمائے اور جسے چاہے قبول نہ فرمائے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کے لیے ایصالِ ثواب کریں جو اللہ کی نگاہ میں مومن ہی نہ ہو، یا سخت

مجرم ہو اور اللہ اسے کسی ثواب کا مستحق نہ سمجھے۔

ایصالِ ثواب کرنے والے نے اگر واقعی کوئی نیک عمل کیا ہو تو اس کا اجر بہرحال ضائع نہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اگر متوفی کو ثواب نہ پہنچائے گا تو نیکی کرنے والے کے حساب میں اس کا اجر ضرور شامل کرے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی شخص کے نام منی آرڈر بھیجیں۔ اگر وہ منی آرڈر اس کو نہ دیا گیا ہو تو لازماً آپ کی رقم آپ کو واپس ملے گی یا مثلاً آپ جیل میں کسی قیدی کو کھانا بھیجیں۔ اگر حکومت یہ مناسب نہیں سمجھتی کہ ایک ظالم مجرم کو نفیس کھانے کھلائے جائیں تو وہ آپ کا بھیجا ہوا کھانا پھینک نہیں دیگی، بلکہ آپ کو واپس کر دیگی۔

۲۔ ایصالِ ثواب ہر ایک کے لیے کیا جا سکتا ہے، خواہ متوفی سے کوئی قرابت ہو یا نہ ہو اور خواہ متوفی کا کوئی حصہ آدمی کی تربیت میں ہو یا نہ ہو۔ جس طرح دعا ہر ایک شخص کے لیے کی جا سکتی ہے اسی طرح ایصالِ ثواب بھی ہر ایک کے لیے کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے چند یہ ہیں:

قرآن کہتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اس میں چوری کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے حتیٰ کہ اگر آپ کا اپنا بچہ ایک پیسہ آپ کی جیب سے نکال لے تو وہ بھی چور قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہاتھ کی بھی کوئی حد نہیں بتائی گئی ہے۔ سیدھا یا بایاں؟ کلائی کے پاس سے یا شانے کے پاس سے یا کہنی کے پاس سے؟ ان سب امور کے متعلق سارے تعینات حدیث میں کیے گئے ہیں۔ انہیں آپ نظر انداز کر دیں تو اندازہ کر لیجیے کہ حکم کی تعمیل میں کیسی کچھ زیادتیاں ہو سکتی ہیں۔

قرآن حج کی فرضیت کا عام حکم دیتا ہے اور یہ صراحت نہیں کرتا کہ آیا ہر سال ہر مستطیع مسلمان پر حج فرض ہے یا عمر میں ایک مرتبہ ادا کرنا کافی ہے۔ موخرالذکر بات صرف حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ اگر اسے آپ قبول نہ کریں تو قرآنی حکم کے عموم کا تقاضا یہ ہے

کہ ہر سال ہر مستطیع مسلمان حج کے لیے جائے۔

قرآن چند اقسام کی عورتوں کو حرام قرار دینے کے بعد کہتا ہے کہ ان کے ماسوا دوسری عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لیے حلال ہے۔ ان حرام کی ہوئی عورتوں میں محرماتِ ابدیہ کے علاوہ صرف سالی کا ذکر ہے جبکہ اس کی بہن آدمی کے نکاح میں زندہ موجود ہو۔ عورت کی خالہ اور پھوپھی کا ذکر نہیں ہے۔ یہ بات حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ عورت کی اپنی بہن کی طرح اس کے باپ کی بہن اور اس کی ماں کی بہن بھی اس کے ساتھ ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس تشریح کو نظر انداز کر دیا جائے تو آدمی حکم کے عموم سے غلط فائدہ اٹھا کر وہی خرابی برپا کر سکتا ہے جس سے روکنے کے لیے شریعت نے جمع بین الاختین کو حرام کیا ہے۔

قرآن سونے اور چاندی کے جمع کر رکھنے پر سخت وعید کرتا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۳۵، ۳۶ کے الفاظ ملاحظہ فرمالیں۔ اس کے عموم میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ آپ سونے یا چاندی کا ایک تار بھی اپنے گھر میں رکھ سکیں۔ یہ حدیث ہی ہے جس نے اس کے منشا کی توضیح و تشریح کی ہے۔

۴۔ قرآن میں کسی حکم کا نہ ہونا اور حدیث میں ہونا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ حدیث قرآن سے زائد ایک حکم بیان کرتی ہے نہ یہ کہ حدیث قرآن کے مخالف حکم دے رہی ہے۔ مثلاً نماز کی رکعات اور اس میں پڑھی جانے والی عبارات اور نماز کی دوسری تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔ حج کے تمام مناسک قرآن میں بیان نہیں ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی شرحیں اور دوسری تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔ اذان کے الفاظ قرآن میں نہیں ہیں۔ اس طرح کے جتنے زائد احکام ہم کو حدیث سے ملتے ہیں وہ قرآن سے زائد ضرور ہیں مگر اس کے خلاف نہیں ہیں۔ قرآن کے خلاف ہونا یہ ہے کہ قرآن ایک چیز کا حکم دے اور حدیث اس سے منع کرے۔ یا اس کے برعکس قرآن منع کرے اور حدیث اس کا حکم دے۔ ایسی کوئی مثال کسی صحیح حدیث میں نہیں پائی جاتی۔

۵۔ شرعی سزا جاری ہو جانے کے بعد آخرت میں آدمی کی معافی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ آدمی نے اس کے ساتھ خدا سے توبہ بھی کی ہو اور اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہو۔ لیکن اگر بالفرض

ایک شخص نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا گیا، مگر اس نے اپنے گناہ پر اپنے خدا کے سامنے کوئی اعتراف ندامت نہ کیا، کوئی توبہ نہ کی، چوری چھوڑ دینے کا کوئی فیصلہ نہ کیا، بلکہ الٹا اپنے دل میں اس شریعت ہی کو کوستا رہا جس نے اس کا ہاتھ کٹوایا ہے تو خدا کے ہاں اس کے معاف کر دیئے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۶- قرآن یا حدیث میں ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی قوم میں ہی شادی کرے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا عمل اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔

اذان اور نماز کی دعاؤں کے متعلق چند شبہات

سوال: ایک دن میں صبح کی اذان سن رہا تھا کہ ذہن میں عجیب و غریب سوالات اُبھرنے لگے اور شکوک و شبہات کا ایک طوفان دل میں برپا ہو گیا — اذان سے ذہن نماز کی طرف منتقل ہوا اور جب سوچنا شروع کیا تو نماز کی ایک عجیب صورت سامنے آئی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز کس طرح پڑھوں اور کیا پڑھوں۔

ایک مسلمان کو ماں کی گود ہی میں جو اولین درس ملتا ہے وہ یہ ہے "اللہ ہی لائق عبادت ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں" — پھر

(۱) اذان بلاوا ہے خالصتہً اللہ کی عبادت کے لیے جس میں اُس کا کوئی شریک نہیں، تو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ ہی اشہد ان محمداً رسول اللہ کے کیا معنی؟

(۲) نماز میں سورۂ فاتحہ، اخلاص یا کوئی اور سورہ جو ہم پڑھتے ہیں ان میں صرف اللہ ہی کی حمد و ثنا اور عظمت و بزرگی کا بیان ہے اسی طرح رکوع و سجود میں اُسی کی تسبیح و تحلیل بیان ہوتی ہے لیکن جیسے ہی ہم تشہد کے لیے بیٹھتے ہیں تو حضور سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلعم کا ذکر شروع ہو جاتا ہے جیسے کہ تشہد اور درود شریف وغیرہ۔ کیا اس طرح حضور اللہ کی عبادت میں شریک نہیں ہو جاتے؟

(۳) دونوں درود شریف جو ہم پڑھتے ہیں ظاہر ہے کہ حضورؐ اس طرح نہیں پڑھتے ہونگے کیونکہ ہم تو پڑھتے ہیں اللھم صلِّ علی محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ (اے اللہ رحمت فرما محمد پر اور محمد کی آل پر) یہ دونوں درود شریف درحقیقت دعائیں ہیں اور اسی طرح تشہد اور دعا ربّ اجعلنی بھی۔ عبادت نام دعاؤں کا نہیں بلکہ اُس خالقِ ارض و سما کی حمد و ثنا بیان کرنے کا نام ہے تو کیا یہ زیادہ مناسب نہیں کہ عبادت کے اختتام پر دعائیں مانگی جائیں بہ نسبت اس کے کہ عین عبادت میں دعائیں مانگنی شروع کر دی جائیں؟ میرا خیال ہے کہ حضورؐ خود تشہد اور درود شریف وغیرہ نہیں پڑھتے ہونگے کیونکہ آپؐ سے یہ بعید ہے کہ عین نماز میں آپؐ اپنے لیے دعائیں مانگنے لگتے۔ پھر ذرا تشہد پر غور فرمائیے ظاہر ہے کہ درود کی طرح اگر حضورؐ تشہد بھی پڑھتے تھے تو وہ بھی الگ ہوگا۔ کیونکہ "اے نبی تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اُس کی برکتیں نازل ہوں" کی جگہ آپؐ پڑھتے ہونگے "مجھ پر سلام ہو اور خدا کی رحمت اور اُس کی برکتیں نازل ہوں۔"

(۴) اللہ کی جو عبادت ہم بجا لاتے ہیں اُس کا نام الصلوٰۃ یعنی نماز ہے پھر یہ فرض، سنت، وتر، نفل کیا چیز ہیں اور یہ پڑھ کر ہم کس کی عبادت کرتے ہیں۔ جانتے تو ہم ہیں اللہ کی عبادت بجا لاتے اور پڑھنے لگتے ہیں نماز سنت۔ جس کی نیت بھی یوں باندھتے ہیں دو رکعت نماز سنت، سنت رسول اللہؐ کی وغیرہ وغیرہ۔ کیا اس طرح بھی حضورؐ کا اللہ کی عبادت میں شریک ہو جانا ثابت نہیں ہوتا؟

(۵) نماز کے آخر میں جو سلام ہم پھیرتے ہیں اُس کا مخاطب کون ہے؟

(۶) کیا حضورؐ بھی روزانہ پانچ نمازیں بجا لاتے تھے اور اتنی ہی رکعتیں پڑھتے تھے جتنی ہم پڑھتے ہیں؟ اس سوال کی خدرسے میں نے تحقیق کی لیکن کوئی مستند حوالہ فی الحال ایسا نہیں ملا کہ اس سوال کا جواب ہوتا۔ بخلاف اس کے بخاری

شریف میں یہ حدیث نظر آئی۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر کی دو دو رکعتیں پڑھیں۔ اسی طرح موطا کتاب الصلوٰۃ میں یہ لکھا دیکھا کہ رات دن کی نماز دو دو رکعت ہے۔ یہ دونوں حدیثیں دو دو رکعت نماز ثابت کرتی ہیں۔

ان خیالات و شکوک نے ذہن کو پراگندہ کر رکھا ہے اور اکثر مجھے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ ہماری موجودہ نماز وہ نہیں جو آنحضرتؐ نے بتائی ہوگی۔ خدارا میری الجھن کو دُور فرمائیے اور مجھے گمراہ ہونے سے بچائیے۔ مجھے نماز چھوٹ جانے کا خطرہ ہے۔

جواب:۔ آپ کے دل میں اگر وساوس پیدا ہوا کریں تو ان کی وجہ سے نماز ترک نہ کر دیا کریں۔ بلکہ نماز پڑھتے رہیں اور اپنے وساوس کے متعلق کسی جاننے والے سے پوچھ کر اپنا اطمینان کر لیا کریں۔

جو سوالات آپ نے کیے ہیں ان کے جوابات یہ ہیں:

(۱) اذان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی شہادت دی جاتی ہے نہ کہ خدا ہونے کی۔ پھر آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہوا کہ رسالت کی شہادت دینے سے عبادت میں شرک واقع ہو جائے گا؟ رسالت کی شہادت تو اس لیے دی جاتی ہے کہ ہم خدا کی عبادت اُس عقیدے اور طریقے کے مطابق کر رہے ہیں جو رسولؐ اللہ نے ہمیں سکھایا ہے۔ ہم نے خود اپنی فکر سے یہ طریقہ اور عقیدہ ایجاد نہیں کر لیا ہے۔

(۲) تشہد کی پوری عبارت پر آپ غور کریں۔ پہلے آپ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا سلام پیش کرتے ہیں۔ پھر رسولؐ کے لیے رحمت و برکت کی دُعا کرتے ہیں۔ پھر اپنے حق میں اور تمام نیک بندوں کے حق میں سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ پھر اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دیتے ہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں جو دراصل اللہ تعالیٰ ہی سے اس امر کی دعا ہے کہ وہ حضورؐ پر اپنی نوازشات کی بارش فرمائے۔ پھر اللہ سے اپنے حق میں اور اپنے والدین کے حق میں بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ ان سارے مضامین کو آپ خود

دیکھیں۔ان میں کیا چیز ہے جسے آپ شرک کہہ سکتے ہیں؟ یہ تو ساری دعائیں اللہ تعالیٰ ہی سے ہیں۔کیا اللہ سے دعا کرنا شرک ہے؟ اور کیا اللہ کے رسول کو رسول ماننا شرک ہے؟

(۳) یہ غلط فہمی آپ کو کہاں سے ہوگئی کہ عبادت صرف اللہ کی حمد و ثنا کرنے کا نام ہے اور اللہ سے دعا کرنا عبادت نہیں ہے۔ دعا تو روح عبادت ہے۔قرآن میں جگہ جگہ ان مشرکین کو جو غیر اللہ سے دعائیں مانگتے ہیں، غیر اللہ کی عبادت کرنے والا قرار دیا گیا ہے، حتیٰ کہ اکثر مقامات پر یعبدون من دون اللہ کہنے کے بجائے یدعون من دون اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور حکم دیا گیا ہے کہ اللہ ہی سے دعا مانگو۔

یہ تشہد جو ہم پڑھتے ہیں، یہ حضورؐ نے صحابہ کو سکھایا تھا اور انہیں ہدایت فرمائی تھی کہ تم یہ پڑھا کرو، اس لیے ہم کو نماز میں یہی پڑھنا چاہیے۔رہا حضورؐ کا اپنا تشہد، تو اس کے متعلق احادیث میں کوئی صراحت نہیں ہے کہ حضورؐ خود کیا پڑھتے تھے۔ہوسکتا ہے کہ آپؐ کے تشہد میں الفاظ کچھ مختلف ہوتے ہوں۔اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ حضورؐ خود بھی یہی تشہد پڑھتے ہوں۔اگر ہم نماز میں اپنے لیے دعا کرتے ہیں تو آخر آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے کہ حضورؐ بھی نماز میں اپنے لیے دعا فرماتے ہوں؟ اسی طرح اگر ہم حضورؐ کے نبی ہونے کی شہادت نماز میں دیتے ہیں تو اس میں آخر کیا خرابی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی نبوت کی شہادت دیتے ہوں؟

(۴) فرض نماز کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عبادت جو اس کے عائد کردہ فریضہ صلوٰۃ کو ادا کرنے کے لیے کم سے کم لازم ہے، جس کے بغیر حکم کی تعمیل سے ہم قاصر رہ جائیں گے۔سنت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی وہ عبادت جو فرض کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ادا کیا کرتے تھے اور جس کی آپ نے ہمیں تاکید کی ہے۔نفل سے مراد ہے خدا کی وہ عبادت جو ہم اپنی خوشی سے کرتے ہیں، جسے ہم پر نہ لازم کیا گیا ہے اور نہ جس کی تاکید کی گئی ہے۔اب فرمائیے کہ اس میں شرک کہاں سے آگیا؟ "سنت رسول اللہ کی"

کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ رسول اللہ کی نماز پڑھی جا رہی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض سے زائد پڑھا کرتے تھے اور آپ کے اتباع میں ہم بھی پڑھتے ہیں۔

(۵) کسی عمل کو ختم کرنے کے لیے آخر اس کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ نماز ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ جو قبلہ رو بیٹھ کر عبادت کر رہے تھے، اب دونوں طرف منہ پھیر کر اس عمل کو ختم کر دیں۔ اب منہ پھیرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ چپکے سے منہ پھیر دیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ خدا سے تمام خلق کے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہوئے منہ پھیریں۔ آپ کو ان میں سے کون سی صورت پسند ہے؟

(۶) جن احادیث کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ ابتدائی دور کی ہیں۔ حضورؐ کا آخری عمل، جبکہ نماز کے احکام بتدریج مکمل ہو چکے تھے، یہی تھا کہ آپ پانچوں وقت وہی رکعتیں پڑھتے تھے جو اب تمام مسلمانوں میں رائج ہیں۔ یہ چیز دوسری متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ حضرت عمرؓ کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے وہ نوافل سے متعلق ہے۔

فرعونِ موسیٰ ایک تھا یا دو؟

سوال: میں تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں اپنا ایک شبہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۶۰ء میں سورۂ قصص کی تفسیر کرتے ہوئے جناب نے میرے خیال میں اسلاف مفسرین کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بالمقابل ایک کے بجائے دو فرعون قرار دیے ہیں۔ حالانکہ قرآن کے متعلقہ مقامات کا مطالعہ کرنے سے فرعون سے مراد ہر جگہ ایک ہی شخصیت معلوم ہوتی ہے۔ جس فرعون کی طرف حضرت موسیٰ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے یہ وہی فرعون ہے جو انکارِ دعوت کے بعد غرق ہوا۔ اسی طرح فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کا حضرت موسیٰ کو پرورش کرنا بھی قرآن میں

مذکور ہے۔ اور پھر انہی خاتون کے اسلام لانے پر ان کا فرعون کے ہاتھوں ستایا جانا
بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے فرعون سے نجات پانے کے لیے دعا مانگی تھی
میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے کس بنا پر غرق ہونے والے فرعون کو اس
فرعون سے جدا سمجھا ہے جس کے گھر میں حضرت موسیٰ پالے گئے تھے؟

جواب: "فرعون" مصر کے بادشاہوں کا ایک خاندانی لقب تھا فرعونِ موسیٰ کے بارے میں بنی اسرائیل کی متفقہ روایات یہ ہیں کہ وہ دو تھے۔ جدید تاریخی تحقیقات بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ اور عقل بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ دو ہوں۔ کیونکہ حضرت موسیٰ پچاس سال کی عمر میں نبی ہوکر فرعون کے دربار میں پہنچے ہیں اور تیس سال کی کشمکش کے بعد آخرکار فرعون غرق ہوا ہے اور بنی اسرائیل ملک سے نکلے ہیں۔ گویا اس وقت حضرت موسیٰ کی عمر ۸۰ برس تھی۔ اب یہ بات کم ہی قرینِ قیاس ہے کہ یہ وہی فرعون ہو جس کے گھر میں حضرت موسیٰ نومولود کی حیثیت سے پہنچے تھے اور جس کی بیوی نے ان کو متبنیٰ بنایا تھا موخرالذکر خیال کی تائید میں جو آیتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اس باب میں صریح الدلالۃ نہیں ہیں۔ مثلاً ان میں سے ایک آیت وہ ہے جس میں فرعون کا یہ قول منقول ہوا ہے کہ الم نربك فينا وليدا "کیا ہم نے تجھے بچہ سا اپنے گھر میں نہیں پالا تھا"۔ لیکن کیا باپ کے ہاں پرورش پائے ہوئے آدمی سے بیٹا یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ تجھے ہم نے اپنے ہاں پالا ہے؟ اسی طرح سورۂ قصص میں جس امرأۃ فرعون کا ذکر ہے، بعض کے خیال میں وہ لازماً وہی ہونی چاہیے جس کا ذکر سورۂ تحریم میں آیا ہے؟ لیکن ان دونوں کے دو الگ شخصیتیں ہونے میں آخر کیا چیز مانع ہے؟ قرآن مجید میں ایسی کوئی صراحت نہیں ہے کہ فرعون کی جو بیوی حضرت موسیٰ پر ایمان لائیں، وہ وہی تھیں جن کے سامنے حضرت موسیٰ ٹوکری میں تیرتے ہوئے شیرخوار بچے کی حیثیت سے پہنچے تھے اور جنہوں نے ان کو قتل سے بچا کر بیٹا بنا لیا تھا۔

نبی کریمؐ کے "اُمّی" ہونے کا صحیح مفہوم

سوال: ترجمان القرآن، ماہ اکتوبر سنہ ۶۰ء میں سورۂ عنکبوت کے تفسیری حاشیہ ۹۱ کے مطالعہ کے دوران میں چند باتیں ذہن میں اُبھریں جو حاضر خدمت ہیں۔ اس سیاق و سباق میں لفظ "امّی" کا مطلب جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے امّی اور ناخواندہ تھے لیکن بعد میں آپ کے خواندہ ہو جانے اور لکھ پڑھ سکنے کی نفی نہیں۔ یہ البتہ یقیناً ممکن ہے کہ نبوت کے بعد آپ کے خواندہ بن جانے میں انسانی کوشش یا اکتساب کو دخل نہ ہو بلکہ معجزانہ طور پر اللہ نے خود معلّم بن کر آپ کو پڑھنا لکھنا سکھا دیا ہو۔ میری اس تشریح کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے؟ میرے خیال میں تو الفاظ میں بڑی گنجائش ہے جس سے میرے مطلب کی تائید ہوتی ہے۔

جواب: میں نے جو بات صحیح سمجھی تھی وہ اپنے پورے دلائل کے ساتھ تفہیم القرآن کی اس بحث میں لکھ دی ہے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ اگر میری اس بحث سے آپ کا اطمینان نہیں ہوا تو جو کچھ آپ صحیح سمجھتے ہیں وہی سمجھتے رہیں۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ قرآن مجید کے الفاظ "اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ" پر اگر مناسب سمجھیں تو اور تھوڑا سا غور کر لیجیے۔ اللہ تعالیٰ اس فقرے میں اپنے نبی کو مخاطب کر کے فرما رہا ہے کہ اگر ایسا ہوتا (یعنی تم پڑھے لکھے ہوتے) تو باطل پرستوں کے لیے تمہاری نبوت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش ہو سکتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اس فقرے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب تو ان کے لیے شک کی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہیں ہے، کیونکہ تم ان پڑھ ہو۔ یہ استدلال بالکل بے معنی ہو گیا ہوتا اگر آپ کے قول کے مطابق نبی بناتے ہی اللہ میاں نے حضورؐ کو بطور معجزہ خواندہ بنا دیا ہوتا۔ کیا اس صورت میں شک کی گنجائش ختم ہو جاتی؟ اس صورت میں تو کفار مکہ یہ کہہ سکتے تھے کہ تم نے آج تک ہم سے چھپایا، اب معلوم ہوا کہ تم خفیہ خفیہ لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تھے اور چپکے ہی چپکے کتابیں پڑھ کر یہ معلومات جمع کرتے رہے تھے۔

پھر یہ بھی سوچ لیجیے کہ یہ آیت نبوت کے پانچ چھ سال بعد آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک تو حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے پڑھنا لکھنا نہ سکھایا ہو گا۔ اس کے بعد آخر کس تاریخ کو یہ معجزہ پیش آیا؟ اور کیا مصلحت تھی کہ نبی بناتے ہی حضورؐ کو خواندہ نہ بنا دیا گیا، اور اس کے بعد کوئی تاریخ اس معجزے کے لیے مقرر کی گئی؟ ان امور کی طرف میں صرف آپ کو غور و فکر کے لیے توجہ دلا رہا ہوں۔ خواہ مخواہ بحث کو طول دینا مقصود نہیں ہے۔

مطبُوعات

اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام | تالیف جناب بہاول خاں ناگرہ۔ شائع کردہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالمی گیٹ، لاہور۔ قیمت ایک روپیہ چھ آنے صفحات ۱۱۶

اس کتاب کے مصنف چوہدری بہاول خاں ناگرہ (خدا انہیں تادیر سلامت رکھے) ایک ایسے بزرگ ہیں جو زندگی کے ابتدائی دور ہی سے اصلاحِ معاشرہ کی جدوجہد میں پیہم مصروف چلے آتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں نہایت قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ آج سے چند سال پیشتر جب مجھے اُن کے گاؤں جانے کا اتفاق ہُوا تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُس خاموش انقلاب کے اثرات کو دیکھا جو ملّت کے اس درویش نے اس بستی کے لوگوں کے اندر اپنے خلوص اور ان تھک کوشش سے برپا کیا ہے۔ اس انقلاب کا مرکز و محور اسلام ہے اور اس کا گہوارہ مسجد۔ انہوں نے بڑی کرم فرمائی کی کہ اپنے ان بیش قیمت تجربات کو کتاب کی صورت میں مدوّن کر دیا۔ جو لوگ اس نہج پر ٹھوس کام کرنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتاب کے ایک ایک لفظ سے فاضل مصنف کا خلوص جھلکتا ہے اور اس خلوص نے ہی اُن کی تحریر کے اندر روانی اور بے ساختہ پن پیدا کیا ہے۔ ہم اس کتاب کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

کتاب کا معیارِ طباعت نہایت اچھا ہے اور ہر لحاظ سے اسلامک پبلیکیشنز کے شایانِ شان۔

ماہنامہ چراغِ راہ (نظریہ پاکستان نمبر) | مرتبہ خورشید احمد صاحب ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی و جناب محمود فاروقی صاحب۔ مقامِ اشاعت دفتر چراغِ راہ کراچی۔ قیمت پانچ روپے صفحات ۵۴۳

ماہنامہ چراغ راہ کا یہ خاص نمبر اپنے سابقہ نمبروں کی طرح سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس میں فاضل مرتبین نے پاکستان کی آئیڈیالوجی کے متعلق جو مواد فراہم ہو سکتا ہے، اسے

یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کام اگرچہ بڑا مشکل اور صبر آزما تھا مگر وہ لفضلِ ایزدی اس میں کافی حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔

مضامین میں خاصا تنوّع ہے لیکن ان سب کے اندر یہ چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ پاکستان کا اساسی تخیّل صرف اسلام ہی ہے۔ یہ احیائے اسلام کی کشش ہی تھی جس نے قوم کے منتشر اجزا کو باہم ایک جگہ مربوط کر دیا۔ ان مضامین کے لکھنے والوں میں سنجیدہ طبقوں کے مختلف افراد شامل ہیں۔ علمائے کرام میں مولانا شبیر احمدؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا مفتی محمد شفیع اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں سے جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر حمید احمد خاں، میاں بشیر احمد اور کرنل محمد اسلم صاحب نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں اس موضوع پر جس طرح اظہارِ خیال کیا ہے وہ خاصہ جاذب ہے اور اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں ان مختلف طبقوں کے درمیان حیرت انگیز ہم آہنگی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ مولانا ظفر احمد انصاری کا مقالہ پاکستان، ماضی، حال اور مستقبل بڑا فکر انگیز ہے اور یہ اس لحاظ سے بھی بڑا وقیع اور قابلِ قدر ہے کہ اس کے لکھنے والے ایک ایسے صاحب ہیں جو تحریکِ پاکستان سے نہ صرف آغاز ہی سے وابستہ رہے بلکہ جنہوں نے اس تحریک کی قیادت اور رہنمائی بھی کی خلیل حامدی صاحب کا مقالہ عالمِ اسلام اور نظریۂ پاکستان بڑا معلومات افزا ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے جو کوششیں کی گئیں اُن سے دنیائے اسلام کس طرح متاثر ہوئی۔

ادارۂ چراغ راہ کی یہ کوشش ہر لحاظ سے کامیاب ہے اور وہ اس ملک کے سارے اسلام پسند طبقوں سے ہدیۂ تبریک کی پوری طرح مستحق ہے۔ تبصرہ نگار کو اس نمبر کے مطالعہ کے وقت البتہ ایک چیز ضرور کھٹکی ہے کہ اس میں تحریکِ پاکستان کا جس بنیادی

نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے وہ مسلم لیگ کا نقطۂ نظر ہے۔ دنیا کی کسی تحریک کے بارے میں، جس کی قیادت انبیاء علیہم السلام کے علاوہ عام انسانوں نے کی، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اس کے سارے تقاضوں کو صحیح طور پر پورا کیا۔ اس لیے مسلم لیگ نے پاکستان کا جو تجزیہ کیا ہے اس میں چونکہ ایک حصہ جذباتیت کا بھی ہے اس بنا پر وہ نظرثانی کا محتاج ہے۔ ہمیں بجا طور پر اس بات کی توقع تھی کہ اس معیاری پرچہ کے فاضل مرتبین تحریک پاکستان کے مطالعہ کے لیے ؛ ہمیں ایک صحیح نقطۂ آغاز بھی عطا کرتے۔ باقی یہ کوشش ہر لحاظ سے لائق ستائش ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا غور و فکر سے مطالعہ کیا جائے۔ یہ ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس کا رکھنا ہر ذہین و فہیم انسان کے لیے نہایت ضروری ہے۔

ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ | مجلس ادارت: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی۔ جناب امین اللہ وثیر صاحب، ایم، اے۔ جناب الطاف حسین قریشی صاحب، ایم اے۔ جناب ظفر اللہ خاں ایم اے۔ جناب طاہر قادری۔ ایڈیٹوریل بورڈ کا پتہ: نصرت منزل، ۵ مین روڈ، سمن آباد، لاہور۔ انتظامی دفتر کا پتہ ۱۶ - بیڈن روڈ - لاہور۔ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پانچ آنے۔

اس مشینی دور میں جب کہ زندگی ایک نہایت تند و تیز رو کی مانند ہو گئی ہے اور وقت برق رفتاری کے ساتھ گزرنے لگا ہے، ایک عام انسان کے لیے مختلف کتب اور رسائل کا مطالعہ کرنا قریب قریب ناممکن سا بن گیا ہے۔ چنانچہ یورپ میں ان بدلے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر بعض ایسے رسائل شائع ہو رہے ہیں جن میں مختلف جرائد کا بہترین انتخاب شائع ہو جاتا ہے اور لوگ انہیں کا مطالعہ کر کے وقت کی رفتار کو پہچان لیتے ہیں۔ یہ ضرورت عرصہ دراز سے اس ملک میں بھی محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ اسی ضرورت کے پیش نظر یہ رسالہ نکالا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے اس رسالہ کو ایسے فاضل اساتذہ کی خدمات حاصل ہو گئی ہیں جو

ہر اعتبار سے اس کام کے لیے موزوں ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب ایک عرصہ دراز تک المانیہ کی مختلف یونیورسٹیوں سے مستفید ہو کر پاکستان تشریف لائے ہیں۔ جناب ظفر اللہ خاں اور طاہر قادری صاحب کو اس نوعیت کے کاموں کا وسیع تجربہ ہے۔ اسی طرح ادارہ کے دوسرے ارکان بھی اصحاب علم ہیں۔ چنانچہ ان کی باہمی کوششوں سے جو چند شمارے ابھی منظرِ عام پر آئے ہیں وہ اس کے روشن مستقبل کی پوری طرح غمازی کرتے ہیں۔ طباعت اور کتابت کا معیار نہایت بلند ہے۔

مجلۂ علومِ اسلامیہ | مدیر: ڈاکٹر مختار الدین صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ صفحات ۲۲۱۔ وقفہ اشاعت چھ ماہ۔

مسلم قوم پر جب زوال آیا تو وہ بڑا ہمہ گیر تھا۔ اس کے طاری ہو جانے کے بعد مسلمان نہ صرف سیاسی طور پر مغلوب ہوئے بلکہ وہ فکری میدان میں بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ تلاش و جستجو جس کے لیے وہ پوری تاریخ میں ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل تھے اس کو انہوں نے ترک کر دیا اور دوسروں کی تحقیقات کو آنکھیں بند کر کے قبول کرنے لگے۔

اب جبکہ مسلمانوں نے ایک نئی کروٹ لی ہے تو ان کے اندر تحقیق کا ذوق بھی کسی قدر نمایاں ہونا شروع ہوا ہے۔ زیر تبصرہ رسالہ اسی ذوق کا ایک نہایت اچھا مظہر ہے۔ موشحۃ الشاعرۃ الاندلسیہ نزہون، فرہنگ ابوحفص سغدی، میر جمال الدین حسین انجو شیرازی۔ نقفی اور جہانگیر، کامی شیرازی، رسالہ عزام بن الاصبغ السلمی، مسعودی کی عجائب الدنیا کا نسخۂ علی گڑھ، میر علاء الدولہ کامی قزوینی، محمود بن علی الاستاد الظاہری، ترکی کا ایک غیر معروف کتب خانہ، معرفۃ المذاہب ـــ یہ ہیں وہ چند عنوانات جن پر مغرب و مشرق کے محققین نے قلم اٹھایا ہے۔ جن حضرات کو اس نوعیت کے مضامین سے دلچسپی ہو ان کے لیے یہ رسالہ بڑا قیمتی اور معلومات افزا ہے۔

الرائد | پندرہ روزہ عربی نشرہ (بلیٹن) ہے، جو چار صفحات پر مشتمل دارالعلوم ندوۃ العلماء

لکھنؤ کی انجمن طلباء (النادی العربی) کی طرف سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی میں تقریباً ایک سال سے نکل رہا ہے۔ اس کا مقصد عربی مدارس کے طلباء میں عربی زبان وادب سے دلچسپی اور اس میں انشاپردازی کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ اس میں عالم اسلامی کی مختصر خبروں کے علاوہ عموماً ایک دو مضامین عربی پرچوں سے ماخوذ ہوتے ہیں اور لگا رہے گا ہے خود مولانا سید ابوالحسن ندوی کا کوئی مضمون یا انجمن طلباء میں ان کی کوئی تقریر شائع ہوتی ہے۔

زیر ادارت: شفیق الرحمن، اقبال احمد، تقی الدین۔ مقام اشاعت: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ سالانہ چندہ: ڈھائی روپے۔

البقظہ الرائد کے طرز پر دارالعلوم دیوبند کے طلباء نے بھی اپنی انجمن (الھیئۃ العربیہ) کی طرف سے یہ ماہانہ نشرہ ماہ جنوری ۱۹۶۱ء سے نکالنا شروع کیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے اس کا پہلا شمارہ ہے، جس میں ازہر کے نمائندۂ دیوبند شیخ محمد عبدالوہاب محمود کے پیغام سے اس کا افتتاح کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد بھی طلباء میں عربی زبان سے دلچسپی اور تحریر و خطابت کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔

عربی زبان سے دلچسپی رکھنے والے طلباء کے لیے الرائد اور البقظہ مفید اور کارآمد ہونگے۔

زیر ادارت: سعید الزمان کیرانوی، ارشد فیض آبادی۔ مقام اشاعت: دارالعلوم دیوبند، ضلع سہارنپور۔ یوپی (بھارت)، چندہ سالانہ: ڈیڑھ روپیہ (ہندوستان میں) دو روپے (بیرون ہند)۔

الرابطہ الاسلامیہ یہ ایک اور نشرہ ہے جو بیک وقت عربی اور انگریزی میں الرابطۃ الاسلامیہ (~~International~~ Cultural Islamic Organiration) کی طرف سے اکتوبر ۱۹۶۰ء سے جاری ہوا ہے۔ الرابطۃ الاسلامیہ کا مقصد مختلف ممالک کے مسلمانوں سے رابطہ پیدا کرنا اور ان کو آپس میں ایک دوسرے کے حالات سے متعارف کرنا ہے۔ اس کی تاسیس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیر نگرانی اُن کے چند شاگردوں اور عقیدت مندوں کی مساعی سے عمل میں آئی ہے

اور اس کا دروازہ دنیا کے ہر مسلمان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے الرابطۃ الاسلامیہ کا پہلا شمارہ ہے جس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک طویل مضمون اور مختلف مسلمان ممالک کی خبریں اور ان پر تبصرے ہیں۔ انجمن کا ارادہ ہے کہ وہ سال میں اس قسم کے ۱۲ شمارے شائع کرے جن میں الرابطہ کی سرگرمیاں منظرِ عام پر لائی جایا کریں۔ زیرِ نظر شمارہ گلیز آرٹ پیپر پر نہایت عمدہ طباعت کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ پرچہ میں اس کے چندہ کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔ غالباً اس کی تقسیم و اشاعت صرف الرابطہ کے ممبروں تک محدود ہے۔ زیرِ ادارت: سید محمد الحسن، صدر الرابطۃ الاسلامیہ۔ مقام اشاعت ۳۷، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

(ادارہ)

(بقیہ: پاکستان میں عیسائیت کی رفتارِ ترقی)

ان عیسائیوں کی اکثریت بھی اُن لوگوں پر مشتمل تھی جو اچھوت اقوام سے عیسائی ہوئے تھے۔ اعلیٰ ذات کے بنگالی ہندو جو عیسائی ہوتے، ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔

اس پورے دور میں اگرچہ مسلمان سخت بدحالی اور پس ماندگی میں مبتلا رہے ہیں لیکن اُن کی کوئی قابلِ ذکر تعداد دائرۂ اسلام سے خارج نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس ۱۸۹۱ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک مردم شماری کی رپورٹوں کے مطابق مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا جس کی وجہ محض توالد و تناسل ہی نہ تھی بلکہ بہت سے ہندوؤں نے بھی اس عرصے میں اسلام قبول کیا۔ عیسائیوں کے لگاتار پرچار کے باوجود ۱۸۸۱ء تک موجودہ پاکستان کے علاقہ جات میں عیسائیوں کا تناسب ایک فی چھ ہزار سے زیادہ نہ تھا۔ ۱۹۰۱ء تک بھی یہ نسبت ایک فی ہزار سے آگے نہ بڑھ سکی اور اس وقت بھی باعتبار اوسط عیسائی ایک شہر میں صرف پانچ سے لے کر پندرہ تک کی تعداد میں پائے جاتے تھے۔

تقریباً یہی صورتِ حال تقسیم کے وقت تک برقرار رہی ہے۔ پنجاب اور کراچی کو چھوڑ کر سندھ، بلوچستان، سرحدی صوبہ، بہاولپور اور خیرپور میں ۱۹۴۱ء تک عیسائیوں کی دو صد سالہ تبلیغی جد و جہد اور پیدائشی اضافے کے باوجود ان کی کل تعداد گیارہ ہزار نفوس تھی۔ ان میں بھی اکثر و بیشتر افراد اچھوتوں سے عیسائی ہوئے تھے اور اسلام کو چھوڑ کر ان میں داخل ہونے والے بمنزلہ صفر تھے۔ پوری آبادی کے لحاظ سے عیسائیوں کی یہ تعداد ایک فی ہزار سے بھی کم تھی۔ ۱۹۳۱ء میں متحدہ بنگال میں عیسائی ½ فی صد (بلکہ اس سے بھی کم یعنی ۰.۲۶) تھے اور یہ تعداد بھی مردم شماری کے افسران کے نزدیک ۱۸۸۱ء کی تعداد سے تگنی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں بنگال کے شمالی اور مشرقی اضلاع کی کیفیت یہ تھی کہ ان میں یورپین اور ہندوستانی عیسائیوں کی تعداد علی الترتیب فقط انیس (۱۹) اور سولہ (۱۶) فی دس ہزار تھی۔ اس تعداد میں ظاہر ہے کہ ہندوستانی عیسائی نہایت قلیل تھے اور وہ بھی مسلمانوں میں سے

نہیں بلکہ ہندو اچھوتوں میں سے نکل کر آئے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں پورے چاٹگام ڈویژن کی آبادی چوراسی لاکھ ستتر ہزار آٹھ سو نوے ۸۴۷۷۸۹۰ تھی جس میں سے صرف چودہ سو اٹھارہ ۱۴۱۸ عیسائی تھے راجشاہی ڈویژن کی کل آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ چالیس ہزار چار سو پینسٹھ تھی جس میں عیسائی صرف نو ہزار دو سو اٹھائیس تھے۔ بحیثیت مجموعی اگر یورپین اور اینگلو انڈین شہریوں اور سپاہیوں کو نکال کر دیکھا جائے تو موجودہ مشرقی پاکستان میں عیسائیوں کی تعداد محض برائے نام تھی۔ (باقی)

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

''اسلامی نظریات اور اسلوب فکر پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو جو دسترس حاصل ہے اور جس خوبی سے وہ ان مسائل کو بیان کر گزرتے ہیں وہ دور حاضر میں انہی کا حصہ ہے زیر نظر کتاب در حقیقت موصوف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۳۲-۳۳ء میں لکھے تھے لیکن کتاب کی شکل میں انکی اشاعت پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں ہوئی اب خود مصنف کی نظرثانی کے بعد اسے شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں مختصر طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کے بنیادی عقاید اور اساسی نظریات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید اور ضروری ہے اسے پڑھنے کے بعد ایک عام شخص بھی یہ جان سکتا ہے کہ خدا، غیب، انبیاء، الہی کتابوں، قیامت، موت کے بعد زندگی اور دوسرے بنیادی عقیدے کیوں ہیں۔ کیسے ہونے چاہئیں۔ اور یہ دین کی اساس کیوں کر ہیں؟ اسلام اور قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے اس کتاب میں ہر باشعور آدمی کے لئے اپیل ہے۔ مفہوم بلند اور عالمانہ ہونے کے باوجود انداز تحریر سبک اور شگفتہ ہے۔

پاکستان میں جس کی تشکیل و تعمیر ہی اسلامی عصبیت کی اساس پر ہے ایسی کتابوں کی اشاعت زیادہ سے زیادہ کرنی چاہئے جو دین سے بیگانگی کے رحجانات کا موثر سدباب کر سکیں اور عام خواندہ طبقے کو اسلام سے روشناس رکھ سکیں۔''

(روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۰ء)

قیمت مجلد مع دیدہ زیب گردپوش چار روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ:۔

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ

۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ہماری مطبوعات

منظور شدہ مطابق سرکار 601-950/T B C

مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۶۱ء

(۱)	رسالہ دینیات	از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	۲-۵۰ روپے
(۲)	خطبات	"	۳-۲۵ "
(۳)	پردہ	"	۳-۰۰ "
(۴)	اسلام اور جدید معاشی نظریات	"	۲-۲۵ "
(۵)	ٹوورڈس انڈر سٹیڈنگ اسلام (Towards Understanding Islam)	"	۳-۵۰ "
(۶)	توحید و رسالت اور زندگی بعد موت کا عقلی ثبوت	"	۷۸ پیسے
(۷)	اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر	"	۶۲ "
(۸)	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل		۶۲ "
(۹)	اسلام اور جاہلیت	"	۶۲ "
(۱۰)	سلامتی کا راستہ	"	۳۱ "
(۱۱)	داعیء اسلام کی حیات طیبہ	از مولانا عبدالحی رام پوری	۳-۵۳ روپے
(۱۲)	اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام	از چوہدری بہاول خان ناگرہ	۱-۳۸ روپے

منظور شدہ مطابق سرکار 5046-5395/T B C

مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۶۰ء

(۱۳)	نبیوں کے حالات	حصہ اول	از مولانا عبدالحی رامپوری	۳۱ پیسے
(۱۴)	"	دوم	"	۶۲ "
(۱۵)	"	سوم	"	۶۲ "
(۱۶)	"	چہارم	"	۱-۸۸ روپے
(۱۷)	اخلاقی کہانیاں	حصہ اول	از افضل حسین ایم اے۔ ایل ٹی	۳۱ پیسے
(۱۸)	"	دوم	"	۳۱ "
(۱۹)	"	سوم	"	۶۲ "
(۲۰)	"	چہارم	"	۶۲ "